جلد ۱۰۷ جون ۱۹۸۷ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۷ | جون ۱۹۸۷ء مطابق شوال ۱۴۰۷ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر:- ۳۲۴۴۷۸ —— ۸۶۶۳۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق البوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

عید بھی آپ گزار چکے، سو گزشتہ عید کی مبارک! رمضان بھی آپ گزار چکے، رمضان کی بھی آپ کو مبارک! اصل خوشی تو ماہ رمضان ہی میں رکھی گئی ہے، جس میں قرآن نازل ہوا۔ اور نزولِ قرآن کا جشن ہر سال اللہ تعالیٰ کی طرف سے منایا جاتا ہے جس میں فرشتے اور مومن سبھی شریک ہوتے ہیں۔ اِس جشن کا نقطۂ عروج لیلۃ القدر میں رکھا گیا ہے، اور طویل مرحلۂ جشن و تربیت سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کی خوشی عید الفطر کی شکل میں منائی جاتی ہے اور عید الفطر کی بھی اصل اسپرٹ دوگانۂ عید اور تکبیرات اور فطرانہ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب سلسلۂ عبادات ہی عبادات اور طاعات ہی طاعات۔

رمضان کی روزہ داریوں، تراویح کی شب بیداریوں، لیلۃ القدر کی عبادتوں اور دعاؤں، اعتکاف کی تنہائیوں میں اللہ سے قربتوں اور دینِ حق کی تفہیمات کی سعادتوں، نیز عید الفطر میں اچھے لباسوں اور کھانوں کے ساتھ خداپرستانہ اظہارِ مسرت کی لذتوں کا ایک ہی بڑا منشا ہے —— لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندوں میں تقویٰ کی وہ بنیادی صفت اُبھرے جو خدا سے دوری اور راہِ ہدایت سے انحراف اور غلط اور ناجائز اور حرام اُمور کی آلائشوں کے گوارا کرنے پر تیار نہ ہو۔ تقویٰ وہ عظیم الشان روحانی قوت ہے کہ وہ اگر کام کر رہی ہو تو قتل کے لیے اُٹھنے والے ہاتھ کو پکڑ سکتی ہے۔ آنکھ سے چھٹنے والے ناوکِ نگاہِ بد کو ہدف پر پہنچنے سے پہلے ہی ملیامیٹ کر سکتی ہے؟ جو لاکھوں کی حرام آمدنی کو کسی ایمان والے فاقہ کش کے ہاتھ کے لیے انگاروں کا ڈھیر بنا سکتی ہے۔ تقویٰ کارفرما

ہو تو ایسے حیرت ناک واقعات نمودار ہوسکتے ہیں کہ کوئی سلطان یا وزیر سلطنت عہدے کو محض اس بنا پر ٹھوکر مار کر تہی دست ہو کر الگ کھڑا ہو جاتے کہ وہ سلطنت غیر الٰہی قانون پہ ایک نظامِ باطل کو چلانے کا موجب ہے۔

اِس جوہرِ تقویٰ کے بغیر قرآن کی ہدایت پر عمل نہیں ہو سکتا، اس کا قانون نافذ کرنے کی استطاعت بڑے بڑے شہریاروں میں پیدا نہیں ہوسکتی ——— اور اگر تقویٰ بلاشعور کی عمومی سرسری سطح میں بھی پستی آجائے تو انسانوں کی عام اجتماعی زندگی بھی ضروری تحفظات کے ساتھ بسر نہیں کی جاسکتی۔

اب دیکھ لیجیے اپنے دور کے عالمی علوم اور ترقیات اور ادارات کو اور پھر اندازہ کیجیے کہ انسان کتنی سہولتوں اور سامانوں کے میسر ہوتے ہوئے بھی ایک طرف دوسروں کے لیے وجہِ آزار بنا ہوا ہے اور دوسری طرف اسے اپنی حد تک بھی ذہنی سکون اور قلبی راحت میسر نہیں۔ معاشرہ اور فرد دونوں اپنے اپنے گھمداوں میں چکر کھا رہے ہیں اور راہِ نجات نہیں۔

اللہ کے عذاب کا یہ سلسلہ بڑا عجیب اور غیر معمولی ہوتا ہے کہ فرد یا معاشرے کو ان کے اپنے ہی اعمال کے کڑوے کسیلے اور زہریلے پانی میں غوطے پر غوطے دیے جائیں اور یہ سلسلہ کہیں نہیں رکتا۔ اس وقت مجموعی طور پر ساری انسانیت اپنی ہی عملی کج فکریوں، اپنے ہی ایجاد کردہ پیچ بیچ فلسفوں، اپنے ہی بلند بام ارادوں اور اپنی ہی عافیت سوز تعزیہات میں ڈبکیاں کھا رہی ہے۔

دُور کی باتوں کو دُور چھوڑیے۔ اپنے یہاں دیکھیے۔

میں اور آپ کھانے، پہناوے، رہن سہن اور گھریلو سامانوں، آرائشوں اور آسائشوں سے پچھلی نسلوں سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ شرحِ خواندگی کا اضافہ کم سہی، مگر ایک تو بڑے سے بڑے درجہ ہائے تعلیم تک پہنچنے والے اصحاب زیادہ ہیں، ساری قوم کے خیالات و کردار پر اثر انداز ہونے والے ذرائع ابلاغ ——— اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن ——— کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ ثقافتی مجالس ہیں، سیمینار ہیں، مذاکرے ہیں، نت نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ رسالے جاری ہیں، کیسٹ ٹیپ پھیل رہے ہیں۔ اب تو ویڈیو کیسٹ کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ دینی تقاریب اور جلسے ہوتے ہیں، جمعہ کے خطبات سارے ملک

میں ہو رہے ہیں۔
اِن وجوہ و اسباب کے نتیجے میں پچھلے پچاس سال کے عرصے میں یہاں کے انسان کو بہت بہتر ایمانی و اخلاقی معیار پر آ جانا چاہیے تھا۔ مگر نتیجہ اُلٹ نکلا۔ کیونکہ ان چیزوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ انسان کو رُوحِ تقویٰ سے مالا مال کر دیتیں۔

پہلے ہمارے ہاں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی وجہ سے اضطراب ہوتا تھا۔ لیکن اب تو سیاسی فضا میں بھی بڑی عدم رواداری ہے۔ افراد میں بھی اپنی بات دوسرے پر ٹھونسنے کا جنون بڑھ گیا ہے۔ اور اسی لیے ذرا ذرا سے اختلاف پہ چاقو نکل آتے ہیں اور پستول چل جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کی کثرت، ان کا بے اُصولاپن، ان کے ہاں شرافت کی ٹھوس قدروں کا فقدان، لوگوں کا اِدھر سے نکل کر اُدھر آتے جاتے رہنا، آپس کی کھینچا تانیوں کی وجہ سے خود پاکستان کی وحدت اور نظریۂ پاکستان کے خلاف رنگا رنگ جھنڈوں اور نعروں کا بلند ہو جانا، یہ سب کتنا دردناک نقشۂ احوال ہے۔
پھر معاشرے کا مجموعی سماں یہ ہے کہ ہر کوئی دولت کی پری کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اور بلند ہوتے ہوئے معیارِ زندگی کے لیے اُچھل رہا ہے۔ اور اپنے آپ کو ضروریات اور خواہشات کے حوالے کرنے کے بعد وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ چوری کرے، رشوت لے، جعل سازی کرے، ملاوٹ سے کام چلائے، سمگلنگ کا دھندا کرے، سرکاری اموال میں خورد برد کرے یا ٹھیکوں اور بیرونی سودوں میں سے کمیشن لے۔ یہ تجربے جتنے جتنے عام ہو رہے ہیں، وہ اندر کا "سیمرغ" پیٹ بھرنے کے لیے اتنے ہی ہاتھی اور مانگ رہا ہے کہ یہ لاؤ، ورنہ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔
آج ہم ایک دوسرے کے لیے جس طرح سانپ اور بچھو بن گئے ہیں، کیا یہ عذاب نہیں ہے؟

اور کیا یہ عذاب نہیں ہے کہ اسلحہ ہمارے ہاں بڑوں، جوانوں اور بچوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح ہے اور لوگ بے باکی سے انسان کو اس طرح مار دیتے ہیں جیسے کوئی چیونٹی مسل دی، اور پھر

اس کارنامہ پر فخر کرتے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ہماری دشمن طاقتوں نے ہماری تباہی کا ایک سامان یہ کیا ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ مہلک اسلحہ پہنچا دیا ہے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ جہاں ذرا اختلاف ہوا، یا اپنی بات ٹھونسنی ہوئی، فوراً کلاشنکوف کا دہانہ کھول دیا۔ یعنی ایک دوسرے کو مارتے جاؤ، باہر کے کسی حملے کی ضرورت ہی نہیں، اور کسی دشمن فوج کی احتیاج ہی نہیں، تم خود ہی اپنے دشمن اور خود ہی اپنے قاتل بنتے رہو۔ بڑے پیمانے پر جو کچھ کراچی میں ہوا اور ہو رہا ہے اور مزید ہونے کا خطرہ ہے۔ (خدا کرے کہ نہ ہو) اسے سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ہم اپنی جڑیں آپ کاٹنے میں کتنے استاد ہیں۔ ہم کس طرح پھٹ سکتے ہیں؟ آناً فاناً ہم دشمن نسلی اور علاقائی جتھوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اپنوں پر ہم بم پھینک سکتے ہیں، اپنوں کو ہلاک کر سکتے ہیں، اور اپنوں کے گھر جلا سکتے ہیں۔ یہ اجتماعی خودکشی کا ایک راستہ ہے جس پر دو ایک قدم چل کر دیکھا گیا ہے کہ یہ کہاں تک کامیاب رہتا ہے، اور ہماری کرم فرما طاقتیں بھی یہ اندازہ کرنا چاہتی ہیں کہ مسلمان ان کے اشاروں پر بے وقوف بن کر کس حد تک جا سکتا ہے۔ ہاں جناب! ہمارا مسلمان بڑی تیز رفتاری سے آپ کے اشاروں پر بہت دور تک جا سکتا ہے۔ وہ دین، قومی وحدت، ملکی سالمیت اور اپنی آزادی وغیرہ سارے اسباب کو آپ کی جلائی ہوئی آگ میں پھینک سکتا ہے۔

مگر بس اس وقت تک کہ اس کی چشم ایمان وا نہ ہوا اور اس کی شمع شعور روشنی نہ دینے لگے۔

پھر کیا یہ عذاب نہیں کہ دشمن طاقتوں کی تیار کردہ تخریبی قوتیں جا بجا تباہی پھیلا رہی ہیں۔ کبھی کسی مٹھائی کا صفایا ہے، کبھی کہیں سے ریلوے کی پٹڑی اکھیڑ دی ہے، کبھی کسی پل کے ساتھ پلاسٹک بم باندھ دیئے ہیں، کبھی کسی دفتر کو اڑا دیا ہے، اور ہر طرف سے روزانہ بے گناہ انسانی جانوں کی ہلاکت کی خبریں آتی ہیں۔

کیا یہ عذاب نہیں ہے کہ مئی میں شدید سردی اور بارش اور اولوں کی وجہ سے خربوزے اور آم کی فصلوں کی تباہی کے علاوہ گندم کی بربادی بہت بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ اور اب اس کے صحیح اعداد و شمار کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ سبزیوں کی فصلوں کو نقصان پہنچا ہے۔ علاوہ ازیں اگلے موسم کی فصلوں کی بوائی کا سسٹم بھی درست نہیں رہا۔

ہمارے اکابر تو اس کا ایک ہی علاج جانتے ہیں کہ کچھ تو سڑی ہوئی گندم کو غریب طبقوں کی غذا بنا دیا

جائے، کچھ گندم امریکہ سے لی جائے۔ اور کچھ قرضہ زراعتی نقصان کی تلافی کے لیے حاصل کر لیا جائے۔

یہ سارے حالات ایک طرف، اور روس کی آئے دن پاکستانی علاقے پر بمباری اور بھارت، کی مسلسل تیاری اور سازشی کارروائی وغیرہ دوسری طرف۔ گویا ہم دوہری مصیبتوں کی زد میں ہیں۔ اور ہمیں خدا سے ڈرنا چاہیے اور اس کی گرفت کا خوف اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

اس موجودہ لمحے کی پیچیدگیوں سے بچ نکلنے کے علاوہ آنے والے مراحل میں اگر تحفظ مطلوب ہو تو خدا پرستی کی راہ اختیار کیجیے، اپنی غلط روشوں پر توجہ کیجیے اور تقوی کے اصول کو اپنائیے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ آج مصائب کے جس گھیرے میں ہم گھرے ہوئے ہیں کہیں اس کی وجہ نفاذِ شریعت سے ہمارے حکام اور ہماری پارلیمان کی روگردانی تو نہیں؟ اگر ہے تو ووٹروں اور شہریوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ ان کے ووٹوں سے جو لوگ نمائندگی پر آئے ہیں اور اختیارات کے مالک ہوئے ہیں۔ ان کے اعمال کی ذمہ داری کیا لوٹ کر خود ووٹروں اور شہریوں پر تو نہیں آتی؟ یقیناً آتی ہے۔ تو پھر آپ سب کا فرض ہے کہ اپنے منتخب کردہ نمائندوں اور حکام پر دباؤ ڈالیں اور اُن سے مطالبہ کریں کہ وہ شریعت بل کو پاس کر کے خدا کے قانون کو عملاً نافذ کریں۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

ایمان اور نظامِ اسلامی

(ادارہ)

ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذہبی عقیدہ ہی کی نہیں، بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی سیرت کا بھی انحصار ہے۔ وہی ان کے معاملات کی درستی کا بھی ذمہ دار ہے۔ وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے، وہی ان کی قوم اور ان کی تہذیب کی محافظت بھی کرتا ہے، وہی ان کے تمدن، ان کی معاشرت اور ان کی سیاست کا مایۂ خمیر بھی ہے۔ اس کے بغیر اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ بہ حیثیت ایک تہذیب و تمدن اور نظامِ سیاسی کے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔

ایمان ضعیف ہو تو یہ محض مذہبی عقیدہ کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ہو جائیں۔ ان کی سیرتیں کمزور ہو جائیں۔ ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے، ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور باعزت اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔

جو لوگ دعوتِ ایمان کو علانیہ رد کر دیں اُن کا معاملہ تو صاف ہے۔ اُن کے اور مسلمانوں کے

درمیان کفر و ایمان کی سرحد اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر کوئی خلل برپا نہیں کر سکتے۔ مگر وہ لوگ جو مومن نہیں ہیں اور ایمان کا اظہار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں ۔ اور وہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے اور وہ جو ضعیف الایمان ہیں۔ ان کا وجود نظامِ اسلامی کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے دائرے میں تو داخل ہو جاتے ہیں، مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت اختیار نہیں کرتے، اسلامی قوانین کا اتباع اور حدودِ الٰہی کی پابندی نہیں کرتے، اپنے اخلاق و اعمال سے مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے دلوں کے کھوٹ سے مسلمانوں کی قومیت اور سیاسی حرمت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔ اور ہر اس فتنے کے اٹھانے اور بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں جو اسلام کے خلاف اندر سے یا باہر سے برپا ہوتا ہے۔

(اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول و مبادی

منتخب اقتباسات از صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۶)

اعتذار

ترجمان القرآن مئی ۱۹۸۶ء میں حسبِ ذیل ۲ ضروری حوالے نہیں دیئے جا سکے۔

۱۔ حکمتِ سید مودودی کے نیچے لکھنا چاہیے تھا:۔

(مطالبۂ نظامِ اسلامی)

۲۔ مضمون "ہم تحریکِ اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟" کے ساتھ حوالہ درج ہونا چاہئے تھا:

(بشکریہ ماہنامہ زندگی بھارت)

فروری ۱۹۸۶ء

(ادارہ)

اسلام میں اختلاف کے آداب

(۴)

عہدِ صحابہ میں اختلاف اور اس کے آداب

ترجمہ و تلخیص: جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

بعض مصنفین نے صحابہ کرامؓ کے کردار اور زندگی کی جس طرح منظر کشی کی کوشش کی ہے اس سے عام لوگوں نے ان کے بارے میں یہ تصور قائم کر لیا ہے کہ یہ لوگ اپنے اوصاف و کردار کے لحاظ سے کچھ اس طرح کے لوگ تھے کہ ان جیسے اوصاف و کردار کے حامل گروہ کا دوبارہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔ دراصل ایسا تصور قائم کرنا نہ صرف روحِ اسلام کے منافی ہے۔ بلکہ اس کو بنیاد بنا کر چند بے راہرو لوگوں نے یہ تاثر دینا شروع کر دیا ہے کہ عہدِ صحابہ کے بعد قرآن و سنّت کے سائے میں اسلامی زندگی گزارنے کے عہد کو واپس لانا محال ہے لہٰذا اس کی کوشش ترک کر دینی چاہیے۔ وہ اپنے اس رویّے سے دلوں میں شریعت کے سایے میں زندگی گزارنے کی اُمید کی کرن کو بجھانا چاہتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی مثالی جماعت قرآن و سنّت ہی کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اور ہدایت کے یہ دونوں سرچشمے ہمارے درمیان بھی موجود ہیں۔ اور یہ ہر زمان و مکان میں اسی طرح کی خدا ترس جماعت کو وجود میں لانے کی مکمل صلاحیت و طاقت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں نظامِ زندگی کے طور پر اپنایا جائے۔ اور ان کی مقرر کردہ راہوں کو اختیار کیا جائے۔ اور ان سے اسی طرح استفادہ کیا جائے جس طرح صحابہ کی جماعت نے کیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں اسی طرز کی جماعت کا عالمِ وجود میں آنا محال ہے۔ گویا کتاب اللہ

اور سنّتِ رسول کو ناقص قرار دینے کے مترادف ہے۔ یہ تاثر دینے کی کوشش کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ان دونوں کا انقلاب آفریں اثر مخصوص حالات کے تابع تھا اور عصرِ حاضر میں پیدا ہونے والے نئے تقاضوں اور نظاموں نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے (معاذ اللہ) نہ صرف یہ کہ باطل اور ناقابلِ قبول ہے بلکہ ایسا خیال رکھنے والا فرد یقینی طور پر صریح کفر و عصیان کا مرتکب ہو رہا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان بہت سے معاملات میں اختلاف رونما ہوتا تھا، جس کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں فرما دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب آپؐ کے دور میں اس طرح اختلاف ہو سکتا تھا تو بعد میں کیسے نہیں ہو سکتا تھا؟ اختلافات پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور وہ بجا طور پر کئی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے لیکن اس کے آداب و اُصول کا بھی وہ پوری طرح لحاظ رکھتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپؐ کے انتقال کے بعد ان کے درمیان واقع ہونے والے کچھ اہم اختلافی مسائل یہ ہیں:-

۱۔ حضور اکرمؐ کے انتقال کے بارے میں اختلاف آپؐ کے انتقال کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپؐ کی وفات کی حقیقت کے سلسلے میں پیش آیا۔ سیدنا عمرؓ اس بات پر مصر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی اور یہ محض منافقین کی طرف سے پھیلائی ہوئی افواہ ہے حتیٰ کہ آپؓ نے انہیں اس پر دھمکیاں بھی دیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے تو آپؓ نے یہ آیت تلاوت کی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۱۴۴)

(اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

اس کے بعد پھر انہوںؓ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت کی:

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ - (الزمر - ۳۰)

" (اے نبیؐ) تمہیں بھی موت آنے کی اور انہیں بھی مرنا ہے"

یہ آیات کریمہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے تلوار گر گئی - اور ساتھ ہی خود بھی زمین پر گر پڑے، اور انہیں آپؐ کے وصال اور وحی کے انقطاع کا یقین ہو گیا - اور حضرت ابو بکرؓ کی تلاوت کردہ آیات کے متعلق وہ خود کہا کرتے تھے: بخدا، گویا کہ میں نے انہیں پہلے کبھی پڑھا ہی نہیں تھا"

بعد میں اپنی خلافت کے دوران میں حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کے ایک سوال کے جواب میں اپنے اس موقف کی یہ توجیہہ فرمائی کہ یہ غلط فہمی اس آیت کریمہ کی وجہ سے ہوئی تھی:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا - (البقرہ - ۱۴۳)

" اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو"

چنانچہ میں جب بھی اس آیت کریمہ کی تلاوت کرتا اس سے یہی سمجھتا کہ حضور اکرمؐ اپنی امت کے درمیان میں ہمیشہ موجود رہیں گے تاکہ آخری زمانے تک اس کے اعمال پر شہادت دے سکیں - اسی بنا پر میں نے یہ بات کہی تھی۔

گویا کہ آپؓ نے ان آیات کے مفہوم کو سمجھنے میں اجتہاد سے کام لیا اور یہ سمجھا کہ اس سے مراد دنیا میں گواہی ہے - جس کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے آخری دور تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے رہیں۔

۲ - تدفینِ رسولؐ کے بارے میں اختلاف | صحابہ کرامؓ کے مابین اس بارے میں بھی اختلاف واقع ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے - کسی نے کہا کہ آپ کو مسجد نبوی میں دفن کیا جائے - کسی نے آپؐ کو اصحابؓ کے ساتھ دفن کرنے کا خیال ظاہر کیا - حضرت ابو بکرؓ نے کہا: میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ " ہر نبی کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس کی روح قبض ہوئی" چنانچہ جس بستر پہ آپؐ کی وفات ہوئی تھی اسے اٹھا کر وہیں زمین کھود کر آپؐ کی قبر مبارک بنائی گئی -

۴ ـ خلافتِ رسولؐ پر اختلاف
اس بات پر بھی صحابہؓ کا آپس میں اختلاف واقع ہوا کہ خلافت مہاجرین کا حق ہے یا انصار کا؟ خلیفہ بس ایک ہو یا کئی ایک؟ اس اختلاف کو بھی انہوں نے آنحضورؐ کے اُسوۂ حسنہ اور اقوال کی روشنی میں نہایت عمدہ طریقے سے حل کر لیا جس کی تفصیل کتبِ سیرت میں موجود ہے۔

۵ ـ مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں اختلاف
یہ چوتھا اہم معاملہ تھا جس کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے مابین اختلاف وقوع پذیر ہوا۔ جسے انہوں نے اپنی نیتوں کی سچائی اور اختلاف کے آداب پر سختی سے کاربند رہنے کی وجہ سے بحسن و خوبی حل کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت کے بعد بعض نومسلم قبائل ارتداد کا راستہ اختیار کر کے مسیلمہ کذاب جیسے جھوٹے مدّعیانِ نبوت کے پیروکار بن گئے تھے۔ اور کچھ قبائل نے نماز اور زکوٰۃ سے اور بعض دیگر قبائل نے صرف زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ دراصل ان لوگوں کا حضرت ابوبکرؓ کو زکوٰۃ نہ دینے کا سبب جاہلانہ تکبر و نخوت تھی۔ شیطان نے ان کے ذہن میں ایک غلط تاویل بھی ڈال دی کہ شرعی اُصول کے مطابق زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے کہ مندرجہ ذیل آیت میں زکوٰۃ لے کر ان کے تزکیہ و تطہیر اور ان کے لیے دُعا کرنے کے حکم کے آپؐ ہی مخاطب تھے

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (التوبہ ۹:۱۰۳)

"اور ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں صاف اور پاکیزہ کرو۔ اور ان کے حق میں دُعائے رحمت کرو، کیونکہ تمہاری دُعا اُن کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

مانعینِ زکوٰۃ یہ بھول گئے یا انہوں نے اس بات سے تجاہلِ عارفانہ برتا کہ یہ خطاب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود نہیں بلکہ آپ کے بعد امورِ مملکت سنبھالنے والے ہر خلیفہ و نائب کے لیے بھی ہے۔ اس لیے کہ آپؐ سے یہ خطاب اسلامی ریاست کے سربراہ اور مسلمانوں کے امام کی حیثیت سے تھا۔ اور زکوٰۃ وصول کر کے اس کے مستحقین تک پہنچانا معاشرے کو منظم کرنے اور اس کے انتظام کو چلانے کے سلسلے میں کیے جانے والے امور کا ایک حصہ ہے جس کی ذمہ داری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد مسلمانوں کے معاملات چلانے والے آپؐ کے نائبین تک منتقل ہوتی رہے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والا ہر مسلمان نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی بھی بیعت کرتا تھا۔ اس لیے دونوں فریقوں کے درمیان تفریق کا کوئی جواز نہیں تھا۔ خلیفۂ اوّل کا موقف بھی یہی تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کا فیصلہ کیا تاکہ انھیں زکوٰۃ ادا کرنے اور توبہ کرکے دائرہ اسلام میں واپس آکر حضورِ اکرمؐ سے کیے گئے عہد و پیمان کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔

خلیفۂ اوّلؓ کے اختیار کردہ اس موقف پر ان کے اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا جن کی رائے شروع میں ایسے لوگوں سے جنگ نہ کرنے کی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: "جب رسولِ اکرمؐ کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کے سامنے بعض قبائلِ عرب کے کفر و ارتداد کا مسئلہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار نہ کرلیں۔ پھر جس نے اس کلمہ کا اقرار کرلیا اُس کی جان و مال امان میں ہے....." تو جب یہ لوگ کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے کے بعد اپنی جان و مال کی امان پاچکے ہیں تو پھر آپ ان سے کیسے جنگ کرسکتے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: "میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرے گا۔ اس لیے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے بخدا اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی، جو وہ رسول اکرمؐ کو دیتے تھے روکیں گے تو میں اُن سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا جنگ کے بارے میں شرحِ صدر دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ یہی حق اور صحیح راستہ ہے"۔

حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کرلیا۔ اس لیے کہ جس طرح نماز کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کا منکر بھی مرتد ہوجاتا ہے جس سے جنگ واجب ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم کی کئی آیات اور احادیث مبارکہ میں نماز اور زکوٰۃ کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اگر ایسا مضبوط موقف اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اسلام کی یہ قوت و شوکت نہ ہوتی اور وہ صرف مکہ و مدینہ تک محدود ہوکر رہ جاتا، اور ارتداد وغیرہ کے فتنے پورے

جزیرۂ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

۵۔ بعض مسائل فقہیہ میں اختلاف

ان نازک معاملات کو چھوڑ کر جن کا فیصلہ ہو گیا تھا، اگر ہم دوسرے اختلافی مسائل کا جائزہ لیں تو آدابِ اختلاف اور علماء کی طرف سے ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم کے حیرت انگیز مناظر سامنے آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اختلافی مسائل کے علاوہ جنگ میں مارے گئے مرتدین کی عورتوں کو قید کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان مختلف فیہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں گرفتار کر کے لونڈیاں بنایا جائے۔ جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے برعکس تھی۔ جنہوں نے اپنے عہد خلافت میں حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے کو توڑ کر انہیں آزاد قرار دے کر ان کے رشتہ داروں کے سپرد کر دیا۔ سوائے ان کے جن کے مالک سے کوئی اولاد ہو گئی ہو، جن میں محمد بن علیؓ کی ماں خولہ بنت جعفر الحنفیہ شامل ہے۔

اسی طرح مفتوحہ اراضی کی تقسیم پر بھی ان کا آپس میں اختلاف تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اسے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے قائل تھے، جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ وہ تمام مسلمانوں کے لیے وقف رہنی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اسے تقسیم نہیں کیا۔

عطیات میں کمی بیشی اور ترجیح کے مسئلے پر بھی ان کی رائے ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ حضرت ابوبکرؓ عطیات میں برابری اور مساوات کے قائل تھے۔ جب کہ حضرت عمرؓ ترجیح کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے عطیات میں مسلمانوں کے درمیان مختلف اسباب کی بنا پر کمی و بیشی کا لحاظ رکھا۔

حضرت عمرؓ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا جب کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اسی طرح کئی اور فقہی مسائل میں ان کے درمیان اختلاف رائے موجود تھا۔ لیکن اس اختلاف کا نتیجہ باہمی محبت و تعلق میں اضافے کے سوا کچھ نہ نکلا، جس کا اظہار حضرت ابوبکرؓ کے اس قول سے ہوتا ہے، جو انہوں نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا، جس نے حضرت عمرؓ کی بطور خلیفہ نامزدگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ نے حضرت عمرؓ کو ہمارا خلیفہ نامزد کر دیا ہے۔ اور آپ کو ان کی سختی کا بھی بخوبی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر آپ سے اس کے متعلق سوال کرے گا تو آپ کیا جواب دیں گے؟" اس وقت آپ نے جواب میں فرمایا تھا "میں کہوں گا، خدایا! تیرے سب سے اچھے بندے کو میں نے ان کا خلیفہ بنایا تھا۔"

دوسری طرف کسی نے حضرت فاروقِ اعظم رضؓ سے کہا کہ آپ حضرت ابوبکر رضؓ سے بہتر ہیں تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا کہ بخدا ابوبکر رضؓ کی ایک رات عمر اور آلِ عمر سے بہتر ہے۔

شیخین کے اختلافات کی یہ ایک جھلک تھی۔ ان کے مابین آراء میں اختلاف تو واقع ہوا مگر دل ایک دوسرے سے جڑے رہے اور چونکہ انہیں آسمانی تعلق کی رسیوں نے جکڑ رکھا تھا اس لیے زمین کی مٹی کا ان پر بس نہ چل سکا۔

حضرات عمرؓ و علیؓ کے مابین اختلافات حضرات عمر و علی رضی اللہ عنہما کے مابین بھی کچھ اختلافات تھے۔ لیکن ہمیشہ باہمی احترام و ادب کے دائرہ ہی میں رہتے۔ ایک واقعہ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں، جس سے آپ اُن اختلافات کی نوعیت کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔ ایک عورت کا شوہر غائب تھا اور اس کے ہاں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ حضرت عمر رضؓ کو یہ بات ناگوار گزری، آپ نے اسے بلا بھیجا۔ قاصد نے جب اُسے حضرت عمر رضؓ کے پاس چلنے کو کہا تو وہ لگی چیخنے چلانے کہ نہ جانے عمر رضؓ نے اسے کیوں بلایا ہے۔ بہر حال جب وہ گھر سے روانہ ہوئی تو خوف و گھبراہٹ کی وجہ سے راستے ہی میں اس کے دردِ زہ شروع ہو گیا۔ جس پر وہ ایک گھر میں داخل ہو گئی۔ جہاں اُس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ لڑکا دو دفعہ چیخیں مار کر وہیں مر گیا۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا۔ بعض نے کہا کہ آپ پر کچھ نہیں۔ آپ تو ادب سکھانے اور نظام درست رکھنے والے حکمران ہیں۔ جب کہ حضرت علیؓ خاموش رہے۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے فرمایا: ان حضرات نے اگر اپنا صحیح خیال ظاہر کیا ہے تو اُن کی رائے درست نہیں۔ اور اگر آپ کی رضا جوئی کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے تو آپ سے خیر خواہی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ اس بچے کا خون بہا آپ پر ہے، اس لیے کہ آپ ہی کی وجہ سے عورت نے خوفزدہ ہو کر (قبل از وقت) بچہ جن دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ بچے کا خون بہا اس کی قوم میں تقسیم کر دیا جائے (مسلم: باب دیۃ الجنین، ابوداؤد، نسائی)

حضرت عمر رضؓ نے امیر المومنین ہوتے ہوئے بھی حضرت علیؓ کی رائے کو اختیار کرنے اور ان کے اجتہاد پر عمل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ جبکہ دوسرے صحابہؓ کی آراء پر عمل کر کے آپ چھٹکارا پا سکتے تھے۔

آزادئ صحافت اور غیر جانبداری

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

بحالئ جمہوریت کے ساتھ یہ مطالبہ زور پکڑ گیا ہے کہ صحافت کو مکمل آزادی ملنا چاہیے۔ ذرائع ابلاغ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور کیسٹ کو آزادی ملنی چاہیے۔ صحافت کا یہ حق ہے کہ وہ برسر اقتدار گروہ کی دھاندلیوں اور غلط کاریوں سے پوری قوم کو باخبر کرے۔ صحافت کا یہ حق ہے کہ وہ معاشرہ کی خرابیوں اور گندگیوں کو عوام کے سامنے پیش کرے۔ صحافت اور ذرائع ابلاغ پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ خواہ ان کے بیان کردہ واقعات کی زد معاشرتی زندگی کی اساس اور بنیاد یعنی عقائد پر پڑے یا اخلاقی اقدار پر پڑے یا شرافت اور شائستگی پر پڑے۔

تصویر آج کل کی صحافت کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے یہ آزادی تصویر سازوں (فوٹوگرافرز) کو بھی ملنی چاہیے۔ وہ ہر قسم کی نیم برہنہ، نیم عریاں نسوانی تصاویر مختلف ناز و ادا کے ساتھ، رنگ برنگ، دیدہ زیب، جاذب نظر شائع کریں، خواہ یہ تصاویر کوک شاستر کو مات کرنے والی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو معاشرہ کی عکاسی کر رہے ہیں۔ جیسا معاشرہ ہوگا ویسی ہی تصویر بنے گی۔

فن کار بھی مظاہرۂ فن کے لیے مکمل آزادی کے طلب گار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر موضوع پر فن پارہ پیش کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ، شعر، گیت، کسی فن پارہ پر کوئی قدغن، کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے، خواہ اس کی زد کسی پر پڑے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر ہر قسم کی تمثیلیں پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

یہ ساری آزادیاں بحال ہوں تو اُن کے خیال میں جمہوریت بحال ہوگی۔ اپنے مطالبے کے حق میں یہ لوگ کچھ اسی انداز سے استدلال پیش کرتے ہیں۔

جمہوریت کا مطلب ہے عوام کی حکومت۔ اس لیے معاشرہ کی واقعی صورتِ حالات سب کے سامنے آنی چاہیے۔ یہ عوام کا حق ہے۔ حقائق اور واقعات کو چھپانے اور عوام کو ان کے حق سے محروم کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کے نقطۂ نظر سے بھی ان کے نزدیک صحیح راستہ یہی ہے کہ معاشرہ کی صحیح صورتِ حالات سب کے سامنے آئے۔ تاکہ اس کی اصلاح کی کوشش کی جاسکے، تاکہ اس کا علاج کیا جاسکے۔

اخلاقی زندگی کا تصور بھی ان کے نزدیک یہ ہے کہ خیر و شر کے دونوں پہلو ایک فرد کے سامنے آنے چاہئیں۔ اب یہ فرد کا کام ہے کہ وہ جس پہلو کو چاہے قبول کرے۔ اور جس پہلو کو چاہے رَد کرے۔ اس لیے خیر و شر بلاکم و کاست پیش کیا جانا چاہیے اور ذرائع ابلاغ یہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ مطالبات پیش کرنے والے لوگ مخلص ہیں اور نیک نیت ہیں اور سب معاشرہ کی اصلاحِ حال کے خواہش مند ہیں۔ پہلی گذارش یہ ہے کہ تیسری بات جو کہی گئی ہے وہ بداہۃً غلط ہے۔ اگر خیر و شر میں رہنمائی اور مشورہ دینے کا حق تسلیم نہ کیا جاتا تو پھر کسی فلسفی، حکیم، دانشور، مفکر، مدبر، مصلح کی ضرورت نہیں تھی اور خود مدیر اور صحافی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے یہ دعویٰ تو بالکل غلط ہے۔

آزادیٔ صحافت کا مطالبہ کرتے وقت یہ لوگ چند باتیں فرض کر لیتے ہیں۔ ان کا پہلا مفروضہ یہ ہے کہ انسان کے سامنے جب بھی خیر و شر، نیکی اور بدی کی دو تصویریں پیش کی جائیں گی تو انسان لازماً خیر کو قبول کرے گا اور شر کو رد کردے گا۔ یہ مفروضہ حسنِ ظن کی ایک اچھی مثال تو قرار دیا جاسکتا ہے، مگر واقعات کی دنیا میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ انسان حق کو حق تسلیم کرنے کے بعد بھی بعض اوقات اس پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔

مرزا غالب فرماتے ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر شخص کو حق کی شناخت اور پہچان ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ حق و باطل کے درمیان آویزش قدیم سے چلی آرہی ہے۔ یہ مسئلہ بہت پہلودار ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حق و باطل اور خیر و شر کی گتھی کو حل کرنے میں فلاسفر صدیوں سے لگے ہوئے ہیں اور پھر خود سب سے زیادہ فکری اختلاف و انتشار میں مبتلا ہیں۔ یونان کے پہلے فلسفی طالیس سے لے کر جدید دور کے سارتر تک ہر شخص کی راگنی جدا ہے۔ شاید ہی کسی بڑے مسئلہ پر دو فلسفی متفق ہوں، لہٰذا خیر و شر کے جس مسئلہ پر صدیوں سے فلسفی اُلجھ رہے ہیں، ہمارے سادہ لوح صحافی یہ یقین رکھتے ہیں کہ خیر و شر، نیکی اور بدی کے دیکھنے سے ہر فرد و بشر، عورت، مرد، بچہ، بوڑھا، راہِ حق پالے گا۔ خود حق کا فیصلہ کرے گا۔ خود حق پر گامزن ہو جائے گا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ نادانی ہے یا حسنِ ظن، یا لادین مفکرین کی فریب دہی ہے۔

ہمارا آج کا معاشرہ نظری اور فکری انتشار میں مبتلا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں دو تہذیبوں کا تصادم برپا ہے۔ یہ تصادم برابر کی حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ ایک تہذیب غالب ہے اور دوسری مغلوب ہے۔ خواہی نخواہی غالب تہذیب — یعنی مغربی تہذیب کے افکار و خیالات، طور طریقے ہمارے معاشرے میں نفوذ کرتے جا رہے ہیں۔ اس لیے معاشرہ میں فکر و نظر کی سابقہ یک رنگی اور یک سوئی مفقود ہے۔ اس معاشرہ میں خیر و شر اور نیک و بد کی تعریف اور انطباق پر پوری قوم متفق نہیں ہے، ایسے معاشرہ کے افراد سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ خیر و شر کے دونوں پہلوؤں کو دیکھ کر ضرور وہ خیر قبول کریں گے۔ اس لیے یہ مفروضہ ہی غلط ہے جس پر آزادی صحافت والوں نے اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے۔

ترسم کہ نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

پھر اس مفروضہ کے حاملین یہ بات بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ معاشرہ میں مرد، عورت، بوڑھے، بچے،

نوجوان ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان عمروں کا، مزاجوں کا، ماحول کا اور تعلیم کا فرق ہوتا ہے۔ ان کے درمیان فہم و فراست، عقل و خرد کا عظیم تفاوت ہوتا ہے۔ نہ سب کی سمجھ یکساں ہوتی ہے، نہ سب کی پسند یکساں ہوتی ہے۔ انسانی معاشرہ نیرنگی، بوقلمونی، اور تنوع کا مرقع ہوتا ہے۔ کسی واقعہ سے اثر قبول کرتے ہیں، کسی تصویر سے متاثر ہوتے ہیں ان کے درمیان بڑا عظیم فرق ہوتا ہے۔ اس صورتِ واقعی کی موجودگی میں کوئی نادان ہی یہ توقع کرسکتا ہے کہ ہر شخص کسی واقعہ کے صحیح محرکات اور صحیح نتائج معلوم کرلے گا۔ ہر شخص کسی تصویر کے صحیح اسباب اور محرکات کا پتہ چلالے گا۔

دشواری کی وجہ ایک اور بھی ہے مادی اور طبعی دنیا میں تو بلاشبہ اگر ایک سبب ہوتا ہے تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہوتا ہے اور جو ہوتا ہے سب کو نظر آتا ہے۔ مگر عمرانی اور معاشرتی دنیا میں اسباب کا بھی ایک سلسلہ ہوتا ہے اور نتائج در نتائج کا بھی ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ یہ سارا سلسلہ غیر مادی ہوتا ہے اس لیے نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ ان کا احاطہ کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اس صورت میں یہ فرض کرنا نادانی ہوگی کہ ہر فرد بشر سلسلہ اسباب و علل خود ہی دریافت کرلے گا، اور خود ہی سلسلہ نتائج در نتائج دریافت کرلے گا، اور پھر اپنی دریافت کی بنا پر حق و ناحق، خیر و شر، نیک و بد کا فیصلہ کرلے گا۔ ایسی توقع امر واقع کے خلاف ہے۔ انسانی تاریخ کے خلاف ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ مفروضہ غلط ہے۔

ذرائع ابلاغ و صحافت کے مالک دعویٰ کرتے ہیں کہ "ہم تو خیر و شر دونوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں" مگر کہاں پیش کرتے ہیں؟

اخبارات، رسائل، ٹی وی وغیرہ میں عورت کی نسوانیت کی تشہیر کی جارہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ عریاں اور اخلاق سوز انداز اختیار کیے جاتے ہیں۔ اخبارات کے درمیان اس سلسلہ میں باہمی مسابقت ہے اور دوڑ جاری ہے۔ عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا سارا ایک طرفہ ٹریفک ہے۔ پاکبازی، عفت و حیا داری کی دوسری تصویر کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معاشرہ کا معزز ترین طبقہ اداکاروں اور اداکاراؤں کا ہے۔ گذشتہ چالیس سال میں ریڈیو اور ٹی وی کے

درس قرآن میں قرآن مجید کی ان آیات کو باریابی کا موقع نہیں ملا جن میں عورت کو حجاب، حیاء اور عفت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اب اگر اس پر صحافی دعویدار ہیں کہ ہم تو تصویر کے دونوں رُخ پیش کرتے ہیں تو بجا ہے۔ ایک طرف تو دیو ہیکل گاما پہلوان ہے اور دوسری جانب مجنون عامری ہے۔ اس مقابلہ کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ایک رُخ کو پوری شدت کے ساتھ اُبھارا جارہا ہے۔ تمام ذرائع ابلاغ اِس "مقدس جہاد" میں ہراول دستہ ہیں۔ کیا یہ استبداد بالقلم اور استبداد بالتصویر نہیں ہے؟ یہ ہے جمہوری اقدار پر آپ کا ایمان اور طرزِ عمل؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اخبارات کی رنگین اشاعتوں نے اور ٹی وی اور ریڈیو کے ڈراموں نے دینی اور اخلاقی قدروں کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ قوم کی نوخیز نسل میں تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ کوئی شخص انکار کرسکتا ہے کہ بے راہروی کی اس فصل کو پکانے اور تیار کرنے میں ڈائجسٹوں اور ٹی وی کے ڈراموں کا سب سے زیادہ دخل ہے۔

آزادیٔ صحافت اور ذرائع ابلاغ کے ان شیدائیوں نے کبھی سوچا ہے کہ جس سفر پر یہ بے لگام آزادی کے خواہاں پاکستانی قافلہ کو پہنچانا چاہتے ہیں، اس کی منزلِ مراد کہاں ہے؟ جس سڑک پر یہ گامزن ہیں وہ ان کو پہنچائے گی کہاں؟ مغرب کا معاشرہ بھی دینی اور اخلاقی اقدار کا حامل معاشرہ تھا۔ چار صدی قبل اہلِ مغرب نے اپنا سفر اس بے لگام آزادی کے زیرِ سایہ شروع کیا تھا۔ وہ اخلاقی دیوالیہ پن اور خاندانی انتشار کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

جہاں آج بھی یک زوجگی کا قانون نافذالعمل ہے وہاں عصمت و عفت کی دھجیاں ہوا میں بکھر رہی ہیں۔ یک زوجی پر نہ کوئی مرد قانع ہے نہ عورت۔ کوئی شے ممنوع نہیں۔ نکاح کی ضرورت نہیں۔ ہم جنسی کو چرچ نے جائز قرار دیدیا ہے گھر کے معصوم بچے باپ اور بھائیوں کی ہوس سے بچ نہیں سکتے۔ سویڈن میں تو برہنہ باڑے ہیں۔ حماموں کی طرح بازار میں جنسی دوکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور خودکشیوں کی بھرمار ہے۔

چودہ سال بعد باپ اولاد کو کھلانے پلانے کا روادار نہیں ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ خود کمائیں اور کھائیں۔ اولاد بھی بڑھاپے میں ماں باپ کو گھر پر رکھنے کی روادار نہیں وہ ان کو دارالضعفاء میں داخل کر آتے ہیں، جو بلدیہ نے قائم کر رکھے ہیں۔ خاندانی اُلفت، خاندانی احترام سب ختم ہو گئے۔

شادی کا مقصد جب لذت اندوزی ہی رہ گیا تو اب زوجین کا ہے کو بچے پالنے کا جھنجھٹ مول لیں۔ ہزارہا گھروں میں میاں بیوی اور کتا بلی تو ملیں گے۔ بچہ کوئی نظر نہیں آئے گا۔ بچوں کی پیدائش ایک فیصد رہ گئی ہے۔ شرح پیدائش کی کمی سے انگلستان، فرانس، جرمنی، روس سبھی ممالک میں ہے۔ وہاں بھی آغاز پسند کی شادی اور مخلوط اجتماعات سے ہوا تھا۔ بعد میں یہ انجام ہوا۔

کیسے لگام آزادیٔ صحافت کے طلب گار پاکستان کی مسلمان قوم کو اخلاقی دیوالیہ پن کے اس سفر پسروانہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اخلاقی دیوالیہ پن کے نتائج جو مغرب میں ظاہر ہو رہے ہیں وہ یہاں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں ہم ہرگز یہ سفر اختیار کرنا نہیں چاہتے۔

خیر و شر، نیک و بد اور حق و باطل کی تمیز کرنے میں حکماء اور فلاسفہ نے بے حد ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو محض عقل کی رہنمائی پر نہیں چھوڑا کہ وہ بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھریں بلکہ انسانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ اس نے اوّل روز سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا۔ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں انبیاء کرام آئے ہیں۔ آخری ہدایت قرآن مجید ہے جو تمام سابقہ ہدایتوں کی جامع ہے۔ اور آخری اسوۂ ہدایت سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جب ہم اللہ پر، رسول پر اور کتاب پر ایمان لے آئے تو اب ہم غیر جانب دار نہیں رہے۔ ہم نے اسلام کو قولاً، فعلاً اور عملاً قبول کر لیا۔ اب ہمارا قول و فعل قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کے مطابق ہونا چاہیے۔ مسلمان بن کر غیر جانب داری کا دعویٰ کرنا تضاد فی نفسہٖ ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی آخری ہدایت پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور پوری دیانت داری سے اس پر عمل پیرا ہوں۔

فحاشی اور بے حیائی کے متعلق اللہ کی کتاب میں واضح ہدایات موجود ہیں۔

۱۔ "میرے رب نے حرام قرار دیا ہے فحاشی کو خواہ ظاہر ہو یا باطن"
(اعراف۔ ۳۳)

۲۔ "جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحاشی پھیلے، وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں"
(نور۔ ۱۹)

آیت کا مفہوم صاف واضح ہے۔ یہ فحاشی پھیلانے کی ہر کوشش کو اور ہر طریقہ کو قابلِ عذاب قرار دے رہی ہے۔ اس میں فحش مضامین، افسانے، قصے، کہانیاں، اشعار، تصویریں، ڈرامے، کھیل تماشے،

سب آگئے - اس میں ریڈیو، ٹی - وی، کیسٹ، ویڈیو سب آگئے - اس کا اطلاق ہوٹلوں، کلبوں اور دوسری مجالس پر بھی ہوتا ہے - جہاں مخلوط تفریحات، مخلوط رقص و سرود اور بے حیائی و عریانی کا اہتمام کیا جاتا ہے -

۳ - "اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بُرائی کو ظاہر کرتا پھرے - مگر یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو وہ کر سکتا ہے، اللہ سب کچھ جاننے والا اور سننے والا ہے"۔

(النساء - ۴ - ۱۱۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ بدی اور فحاشی کا چرچا کرنا بھی غلط ہے - چرچا کرنے سے بدی پھیلتی ہے۔ اس کی اشاعت ہوتی ہے - یہ ڈائجسٹ، ناول، ڈرامے وغیرہ سب بُرائی کا چرچا کرتے ہیں - گندی باتوں کو پھیلاتے ہیں - جیل خانوں میں عادی چور قصے، کہانیاں سُنا سُنا کر نو گرفتاروں کی تربیت کرتے ہیں - گاؤں کی چوپالوں میں بھی بوڑھے لوگ بعض دفعہ بے حیائی کے قصے سُنا کر نئی نسلوں کو بگاڑتے ہیں - ان سب پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے -

صحافت کے لیے صرف منفی ہدایات ہی نہیں دی گئیں، بلکہ مثبت ہدایات بھی دی ہیں - قرآن کہتا ہے:

۱ - "اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہا کرو"۔

(الاحزاب - ۷۰)

۲ - "لوگوں سے بھلی بات کہو"۔ (البقرہ - ۸۳)

۳ - "ان سے معروف طریقے سے بات کرو"۔ (النساء - ۸)

بلاشبہ اسلام اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے - حکمرانوں پر تنقید کا حق سب سے پہلے اسلام نے دیا ہے - ایک بڑھیا بھی خلیفہ وقت پر اعتراض کر دیتی تھی - مگر یہ تمام آزادیاں اسلام کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے ہیں - اسلامی حدود کو پھلانگنے کا حق کسی کو نہیں ہے - اسلام نہ بے لگام جمہوریت کا حامی ہے، نہ مادر پدر آزادی کا قائل ہے - اسلام کا اپنا فریم ورک ہے - اسلامی ہدایات کے تحت جمہوریت بھی درست ہے، اور اظہار رائے بھی صحیح ہے -

پاکستان کے صحافی اور ذرائع ابلاغ کے کارکن سب کے سب بفضلہٖ تعالیٰ مسلمان ہیں - اسلام

بنیادی اقدار پر ان کا ایمان ہے۔ اُن کا آخرت پر ایمان ہے اور آخرت میں محاسبہ پر اُن کا یقین ہے۔ اس لیے قرآن کے الفاظ میں ان کی تصویر یہ ہونی چاہیے۔

"نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔"

(توبہ ـ ۱۱۲)

اس لیے پاکستان کے مسلمان صحافیوں اور اصحابِ ذرائع ابلاغ کے سامنے ہر دم آخرت میں اعمال کی جواب دہی کا تصور رہنا چاہیے۔ ان کو خیر کا طالب ہونا چاہیے۔ ان کو شر سے بیزار ہونا چاہیے۔ ان کی جدوجہد کا ہدف معروف کو پھیلانا اور منکرات کو دبانا ہونا چاہیے۔ اسلامی ریاست کا ایک اہم فریضہ بھی معروف کو پھیلانا اور منکرات کو دبانا ہے۔

بعض مالکانِ اخبار کے متعلق سنا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہماری پالیسی غیر جانب داری کی ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کا مطلب کیا ہے؟ کیا وہ حق و باطل اور خیر و شر کی کشمکش میں غیر جانب دار ہیں؟ کیا وہ کفر و اسلام کی جنگ میں غیر جانب دار ہیں؟ کیا ہدایت اور ضلالت کے درمیان وہ غیر جانب دار ہیں؟ کیا فرعون اور موسیٰ کے درمیان بھی وہ غیر جانب دار رہیں گے؟ کیا ابوجہل اور رسولؐ اللہ کے درمیان بھی وہ غیر جانب دار رہیں گے؟

بحث ونظر

ایک سورہ کی تفسیر پر کچھ معروضات

جناب نور الٰہی صاحب ایڈووکیٹ ۔ گجرات

مئی ۱۹۸۶ء کے ترجمان القرآن میں پروفیسر آسی ضیائی صاحب نے سورۃ العصر کی تفسیر پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں اور لکھا ہے کہ مفسرین اس سورۃ کی جس طرح تشریح کرتے رہے ہیں، اس سے ان کا شرحِ صدر نہ ہو سکا، چنانچہ انہوں نے اپنی رائے سے ایک نئی تفسیر پیش کی ہے اور اس خواہش کا اظہار فرمایا ہے کہ اہلِ علم ان کے نقطۂ نظر کی توثیق کریں۔

میں نے یہ مضمون ایک طالب علم کی حیثیت سے پڑھا ہے۔ اس میں درج ذیل اُمور محلِ نظر ہیں:

۱۔ پروفیسر صاحب نے اس سورۃ کے نزول کا پس منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ ابتدائی مکی دَور میں جب مٹھی بھر ایمان لانے والے آزمائشوں میں گھر چکے تھے .... اس وقت اس معاشرے کے کھاتے پیتے لوگوں....... نے طنزاً یا ازراہِ ہمدردی اُن سے کہا ہو گا کہ تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالتے ہو........! دیکھو زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ تم خسارے کا سودا کر رہے ہو...... اس طرح کی باتیں سُنتے سُنتے مسلمانوں کو بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ اضطراب قدرتاً ہوا ہو گا اور نہ بھی ہوا ہو گا تو کم از کم ان باتوں کا جواب تو ظاہر ہے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مختصراً اور بلیغ جواب دیا گیا کہ زمانہ تو پوری نوعِ انسانی کے خسارے کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ شانِ نزول پروفیسر صاحب کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ شاہ عبدالعزیز رحؒ محدث دہلوی تفسیر فتح العزیز میں فرماتے ہیں:

"سبب نزول ایں سورہ آنست کہ کلدہ بن اسید کہ اورا ابوالاسید نیز گویند کافرے بود کہ با امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ در عہد جاہلیت ہم صحبت بود۔ بعد از اسلام حضرت ابوبکر صدیقؓ سو نزے بایشاں در خورد و گفت کہ یا ابابکر ہمیشہ از زیرکی و ہوشیاری در تجارت وسوداگری سود مند می شدی۔ حالا ترا چہ شد کہ یک بارہ بایں مرتبہ زیاں کار گشتی کہ دین پدر خود را گذاشتی و از عبادات لات و عزیٰ محروم ماندی و از شفاعت ایشاں ناامید شدی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ در جواب آں ناداں فرمود کہ ہر کہ حق را قبول کند و کار نیک پیش گیرد زیاں زدہ نمی شود۔ حق تعالیٰ در بیان ایں مقادلہ تصویب مقولہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایں سورۃ نازل فرمود [۱]"

ترجمہ:۔ اس سورت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ کلدہ بن اسید جسے ابوالاسید بھی کہتے ہیں۔ ایک کافر تھا۔ زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اس کے دوستانہ روابط تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ شخص آپ سے ملا اور کہا: اے ابابکر! تم بڑے عقلمند اور ہوش مند تاجر ہو اور اپنی تجارت میں ہمیشہ فائدہ حاصل کرتے رہے ہو۔ اب تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم نے یک لخت اپنی شخصیت کو گرا کر خسارے کا سودا کیا اور اپنے باپ دادا کا دین ترک کر دیا، لات و عزیٰ کی عبادت چھوڑ دی اور اُن کی شفاعت سے ناامید ہوگئے ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے نادان دوست کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: "جو شخص حق کو قبول کر کے نکوکاری اختیار کرے وہ خائب و خاسر نہیں ہے۔ یہ سورۃ نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس مکالمہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قول کو صائب قرار دیا ہے۔

پروفیسر صاحب کی اختراع اور اس سورہ کے واقعی سبب نزول کا فرق اہل علم پر واضح ہے۔ پروفیسر صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ کفار کے طعنوں کا جواب مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے نادان کافر دوست کو جو جواب دیا۔ اس سے پروفیسر صاحب کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔

---

[۱] تفسیر عزیزی، پارہ عم، ص ۲۰۴-۲۰۵ - مطبع مجتبائی دہلی ایڈیشن ۱۹۲۹ء

۲ــــ پروفیسر صاحب نے خسر (خسارے) کو اس عارضی زندگی تک محدود رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے اور حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ قرآن مجید میں اس مضمون کی حامل متعدد آیات ہیں، مثلاً:۔

ا ــــ "اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا"۔ (آل عمران: ۸۵)

ب ــــ "اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا۔ اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا۔ اور وہ آخرت میں خاسرین میں سے ہوگا"۔ (المائدہ: ۵)

ج ــــ "بے شک خسارہ اٹھانے والے تو وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا"۔ (الشوریٰ: ۴۵)

د ــــ "یہی ہیں جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا اور جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے ان سے جاتا رہا۔ بلاشبہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان پانے والے (اخسرون) ہیں"۔ (ہود: ۲۱-۲۲)

ہ ــــ "یہی لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور وہ آخرت میں بہت نقصان اٹھانے والے (اخسرون) ہیں"۔ (النمل: ۵)

و ــــ "اور سن رکھو کہ شیطان کا لشکر نقصان اٹھانے والا ہے"۔ (المجادلہ: ۱۹)

ز ــــ "اس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (المومنون: ۱۰۲-۱۰۳)

ح ــــ "حضرت شعیبؑ کی قوم میں سے سردار لوگ جو کافر تھے، انھوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم خسارے میں پڑ جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا اور فرمایا کہ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ خسارے میں پڑ گئے"۔

(الاعراف: ۹۰ تا ۹۲)

پروفیسر صاحب سے استدعا ہے کہ وہ ان آیات پر غور فرمائیں۔ اگر خسارے کو اس عارضی دنیاوی

زندگی تک محدود نہ کیا جائے تو مفسرین کرام نے اس سورہ کی جو تفسیر بیان کی ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

۳ — پروفیسر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ آخرت میں زمانہ (العصر) کا وجود ہی نہ ہوگا۔ حالانکہ تخلیقِ آدم سے قبل بھی زمانہ کا تصور تھا۔ اور زمانہ آخرت کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا:

ا — بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ (الدہر - ۱)

ب — اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دن میں پیدا کیا۔ (الفرقان - ۵۹)

آخرت کے متعلق قرآن مجید میں جابجا، یوم الدین، الیوم الآخر، یوم القیامہ، یوم الفصل، یوم التغابن، الیوم الموعود، یوم الجمع، یوم البعث، یوم الحساب، یوم الخلود وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے رُو سے ہزار برس کے برابر ہے۔ (الحج - ۲۲) - آلِ فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ عالمِ برزخ میں وہ صبح و شام آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ (سورۃ المومن - ۴۵ - ۴۶) - یہ صبح و شام اور دنوں اور سالوں کا شمار ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کو بھی محیط ہے۔ آخرت کو یوم الدین (روزِ جزا) اور یوم الفصل (فیصلے کا دن) فرمایا گیا ہے (الصافات - ۲۰ - ۲۱) کیونکہ عالمِ آخرت ہی میں آخری فیصلہ ہوگا کہ کون لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کون نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ اس دن کو اللہ تعالیٰ نے یوم التغابن یعنی سود و زیاں کا دن فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ التغابن آیت ۹ - ۱۰)

آخر میں پروفیسر صاحب سے میری گذارش ہے کہ وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر بھی دیکھیں۔ مولانا مرحوم نے "زمانہ کی قسم کیوں کھائی؟" کے زیرِ عنوان تحریر فرمایا ہے:۔

"پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک اُن کے اعمال کا بدلہ تھے۔ اگر انہوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے اُن کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان ہی حقائق کو یاد دلانے کے لیے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت

سے لازماً اُن کو بھی دوچار ہونا ہے۔

"پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں، لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روزِ قیامت کی باز پرس اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے۔......

" علاوہ ازیں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے۔ کیونکہ اس تھوڑی سی گذر جانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیاتِ چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے، لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں۔ تقوٰی اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس فنا ہو جانے والے باطل اور اس باقی رہنے والے حق پر ثابت قدم رہ کر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل لیتا ہے۔"[1]

اُمید ہے کہ پروفیسر صاحب میری ان معروضات کی روشنی میں اپنے استدلال پر نظر ثانی فرمائیں گے

ایک سورہ کی تفسیر پر کچھ معروضات

(۲)

نعیم صدیقی

ہمارے معزز و بزرگ دانش ور دوست پرنسپل (ریٹائرڈ) آسی ضیائی صاحب نے ایک

---

[1] مجموعہ تفاسیر فراہی، صفحہ ۲۸۱ - ۲۸۲ -

سورہ (سورۂ عصر) پر کچھ "معروضات" پیش کی ہیں۔ ان کو اب تک کی تفاسیر سے اس کا مفہوم سمجھنے میں کامیابی (اور حصولِ اطمینان) نہیں ہوا۔ اُن کا خلاصۂ مطالعہ و تحقیق یہ ہے:

۱۔ تمام انسان (اچھے یا بُرے) بہت بڑے خسارے میں ہیں۔

۲۔ ایک دفعہ یہ خسارہ سب پر نافذ ہو جائے گا۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ یہ خسارہ موت ہے اور موت کو لازماً خسارہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

۴۔ موت کے بعد "اِلَّا" کا استثنائی بیان نتیجہ دکھائے گا۔ یعنی خسارہ واقع ہونے کے بعد "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی صفات رکھنے والوں کو حالتِ خسران سے نکال کر اچھے حالات دیے جائیں گے۔

۵۔ ضیائی صاحب کا خیال ہے کہ اگر اس سلسلۂ استدلال کو نہ مانا جائے تو قانونِ عروج و زوال کا جو تصور حاصل ہوتا ہے اس کے تحت ستم رسیدہ، آفات چشیدہ اور آلام کشیدہ مسلمانوں کا اخلاقی موقف مضبوط نہیں رہتا۔

مَیں اس خلاصۂ بحث کو سامنے رکھ کر کچھ نکات کو قابلِ غور سمجھتا ہوں:

ایک یہ کہ حرفِ استثنا اِلَّا کے استعمال کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پہلے تو بیان کردہ نوع یا گروہ کے تمام کے تمام افراد خسارے سے دوچار ہو جائیں گے اور اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہ ہوگی۔ بعد میں اِلَّا کے اقتضا کے تحت ایک جز کو خسران سے نکال کر فلاح و نجاح سے سرفراز کر دیا جائے گا۔ بلکہ عربی زبان میں "اِلَّا" مجموعی حکم کی زد میں آنے والی صف سے مستثنیٰ افراد کو پہلے ہی سے الگ نکال دیتا ہے۔

سورۂ عصر والے معنوں ہی میں "اِلَّا" کا ایک استعمال سورۂ "تین" میں ہے۔ اس میں پہلی اصولی بات یہ آئی ہے کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"۔ دوسری یہ کہ "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ پھر ہم نے اُسے (اپنے قوانین کے تحت) اسفل سافلین میں گرا دیا۔ یہاں مغالطہ ہو سکتا ہے کہ سارے ہی انسانوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔ جی نہیں، آگے "اِلَّا" کا حرفِ استثنا موجود ہے، یعنی متذکرہ حکم یا فیصلے یا حالت سے انسانوں کے ایک حصے کو بچا لیا گیا ہے، ملاحظہ

فرمایئے " اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ " یعنی ایمان اور عملِ صالح کی صفات جن لوگوں نے پیدا کر لیں وہ اسفل سافلین کے مقام تک گرنے سے محفوظ ہیں[لہ]۔ سورۂ عصر میں بھی یہ الفاظ ہیں: " اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ " اور مزید یہ کہ " وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ " آپس میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا سورۂ تین میں محذوف ہے، کیونکہ ایمان و عملِ صالح کے ساتھ یہ خوبیاں از خود پائی جاتی ہیں۔ کسی نبیؑ یا پیروِ نبی کی دعوت پر جو شخص ایمان لایا ہو اُس نے اس دعوت کو پھیلانے کا سبق تو سیکھ ہی لیا۔

سورۂ حجر میں ہے:

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔

یعنی حضرت لوط علیہ السلام سے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم تو مجرمین کی قوم (کی خبر لینے کے لیے) بھیجے گئے ہیں سب ماسوائے آلِ لوطؑ کے (یعنی ان پر ایمان لانے والے اقربا و رفقا) ۔ لیکن پھر استثناء در استثناء آتا ہے کہ آلِ لوطؑ کو مستثنیٰ کرنے کے معنی یہ نہیں کہ امراۃ لوط بھی بچ نکلے گی۔ نہیں اس کا معاملہ بھی طے ہے، وہ بھی بچ نکلنے والے گروہ میں سے نہیں ہوگی) پیچھے رہ جانے والوں میں ہوگی۔

اب یہاں یہ مطلب نہیں کہ پہلے ساری قومِ لوط مع آلِ لوط کو ہدف بنا لیا جائے گا۔ پھر بعد میں آلِ لوط کو نکال کر زندگی دے دی جائے گی اور پھر ان میں سے امراۃ لوط کو الگ لے جا کر نشانۂ عذاب بنایا جائے گا۔

میری دوسری گزارش یہ ہے کہ نہ ہر موت یکساں ہوتی ہے اور نہ لازمی طور پر موت خسارے دار

لہ اسفل سافلین میں گرنے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی ایمان و اخلاق سے کلیۃً عاری ہو کر بندۂ نفس بنے۔ اور پہلے انسانی شرف سے محروم ہو کر حیوانی سطح پر آئے اور پھر حیوانی سطح سے بھی گر کر شیطانی پستی تک گر جائے۔ ظاہر ہے کہ ایمان اور عملِ صالح سے آراستہ لوگ ان ساری پستیوں سے محفوظ ہیں۔

باثمرناک ہوتی ہے۔ کبھی موت باعثِ ذلّت اور کبھی سرمایۂ فخر ہوتی ہے۔ آخرت کے لحاظ سے بھی موت تو ایک دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر مجرم ایک طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے اور محسن دوسری طرح کے حالات سے۔

آیئے موت کی دونوں قسموں کا حال قرآن سے معلوم کریں۔ نکالیے سورۃ النحل!

۱۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا۔

۲۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

پہلی صورت میں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کی طرف فرشتے آتے ہیں تو وہ بڑھ بڑھ کر عاجزی سے سلام مارتے ہیں کہ ہم تو برائی کرنے والے نہیں تھے۔ اور فرشتے کہتے ہیں، کیوں نہیں، اللہ خوب جاننے والا ہے اس کا جس پر تم عمل کرتے رہے ہو۔ پس جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔

دوسری صورت میں فرشتے پاک صاف لوگوں کی جان لینے آتے ہیں تو انہیں وہ خود سلام کہتے ہیں۔ اور خوش خبری دیتے ہیں کہ سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ، ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے رہے۔

بلکہ اولیں قسم کی "بدموتی" کی تو اور بھی تصویریں موجود ہیں۔ خصوصاً سورۃ الانعام (آیت ۹۳)

"اور کاش تو دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں کی لپیٹ میں ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ لمبے کرکے انہیں کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال کر ہمارے حوالے کرو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب اس جرم کی سزا کے طور پر ملے گا کہ تم جھوٹی باتیں اللہ کے ذمے لگاتے تھے۔ اور اس کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے"۔

بخلاف اس کے آپ کو ان موتوں کا علم ہے جن کو شوق سے پرستارانِ حق نے لبیک کہا۔ مکہ کا میدانِ تنعیم ہو یا مدینہ کے بدر و احد، کہاں کہاں سرفروشانِ دین خاک و خون میں دلی مسرت سے

کے ساتھ لوٹ نہیں گئے۔

بسا اوقات اچھے اور بُرے لوگوں کی موتیں اور ان کے جنازے قدرتِ حق کی خاص علامات بن جاتے رہے ہیں۔

موت خسران اس کے لیے ہے جس کے پاس موت کے بعد کی زندگی کے لیے عقیدہ و عمل اور دعوت و جہاد کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ جس کے پاس آخرت کے لیے اندوختہ ہے اس کے لیے تو موت صرف ایک آڑ ہے اس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان جسے عبور کرنا ہے ___ اچھا آدمی خوشی سے عبور کرے گا۔ اور بُرا آدمی پریشان و ملول ہو کر۔

اصل میں گفتگو کا پس منظر قانونِ عروج و زوال بھی ہے اور نیکی اور بدی کا باہمی تعلق بھی۔ اس مبحث میں بارہا سوچنے والوں کو مغالطے ہوئے، مگر قرآن کا قانون پوری طرح جان لینے کے بعد پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔

کیا رائے ہے اس تقابل میں آپ کی کہ ایک شخص رشوت، سمگلنگ، ملاوٹ، سُود، قمار، شراب فروشی، چوری، ڈاکہ یا کسی اور بُری تدبیر سے اعلیٰ درجے کی بلڈنگ کھڑی کرتا ہے، کرائے پر اس کی دکانیں لگی ہیں، در آمدی برآمدی کاروبار ہو رہا ہے، بچے اُونچے اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں، آسائشوں کے تمام اسباب بہم ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص ہے جو سچی خدا پرستی کے جذبے سے ہر غلط ذریعۂ آمدنی اور غیر اخلاقی حرکت سے بچتا ہے، نتیجتاً ایک جھونپڑی یا کھولی میں رہتا ہے، ماحول غلیظ ہے۔ گھر میں صحتیں خراب رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے راستے بند ہیں۔

بتایئے بہ حیثیت پیروِ اسلام کے آپ دونوں میں سے کس کو کیا سمجھیں گے؟ آیا اوّل الذکر آدمی کو خادمِ اسلام، محبِ رسولؐ، داعیٔ حق، نقیبِ غلبۂ اسلام، خوش اخلاق، اسلامی معنوں میں عروج یافتہ کہیں گے؟

بس یہی مثال افراد، گروہوں، جماعتوں اور اقوام سب میں کام کرتی ہے۔ ایک آدمی ظلم کی چکی میں پس رہا ہوتا ہے، مگر اپنی اس بےبسی میں بھی وہ اسلام کو محبوب ہوتا ہے۔ دوسرا آدمی ظلم اور گناہ کے ذریعے طرح طرح کے کمالات جمع کر کے بہت سے دوسرے لوگوں کی خدمت بھی انجام دینے لگ جاتا ہے، مگر وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی خدا و رسولؐ کا پسندیدہ کردار نہیں ہے۔

کیونکہ اس کے شان و شکوہ کی بنیاد ظلم اور گناہ اور مالِ حرام پر ہے۔

اب آیئے اس بارے میں بھی قرآن سے رہنمائی لیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

"کوئی مرد ہو یا عورت، جو کوئی بھی نیک عملی اختیار کرے گا۔ بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے"

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

"اور جس کسی نے میرے ذکر سے اعراض کیا تو اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی"

سوال یہ ہے کہ کیا ایمان اور عملِ صالح بجائے خود انسانی زندگی میں کوئی مثبت قدر وقیمت نہیں پیدا کرتے؟ ضرور پیدا کرتے ہیں، مگر آپ جب نفع اور خسارے کا مفہوم ایمانی و اخلاقی دائرے سے باہر آکر مادی اصطلاحات میں معین کرتے ہیں تو بات چکر میں پڑجاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ "دنیا میں عروج اور ترقی صرف اہلِ ایمان کی اجارہ داری تو نہیں"۔ مشرک اور بے دین قومیں بھی خوش حالی اور نفع اندوزی کا مزہ چکھ چکی ہیں، مگر دولت اور شائستگی یا بجبر کیفیتی اور خیر خواہی کو متقابلاً دیکھیں کہ ان میں فرق ہے یا نہیں؟

آپ نے اس بارے میں اللہ کا وہ خاص قانون ضرور پڑھا ہوگا جس کی تین شقیں سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ

جو کوئی حاضر دنیا میں فوری فائدہ حاصل کرنا چاہے (اور اس کے لیے کوشش کرے)، تو ہم جس کو جتنا چاہیں جلدی جلدی دے دیتے ہیں، اور پھر اس کے لیے جہنم کو مقرر کر دیتے ہیں۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔

اور جو کوئی طلب گار ہو، آخرت (کی کامیابی) کا اور اس کے لیے اتنی کوشش کرے جیسے اس کے لیے لازم ہے، اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو ایسے لوگوں کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ

ان سب کو ـــ اُس فریق کو بھی، اور اِس فریق کو بھی ـــ ہم نوازتے رہتے ہیں۔

ایک طرف دُنیا پرست لوگوں کا مقدر بیان ہوا، پھر آخرت والوں کو، اور پھر دونوں کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ دونوں کو موقع دیا جاتا ہے۔ اور دونوں کے لیے راستے کھلے ہیں، یعنی غلبہ و کامیابی کا چکر تو چلتا ہی رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ دُنیا پرست اور آخرت والوں کے درمیان دُنیا میں وہ فرق کیا ہے جس کی گواہی زمانہ اور تاریخ دیتے ہیں؟ وہ فرق یہ ہے کہ تصورِ آخرت رکھنے والا خدا پرست چند اعلیٰ اوصاف و اقدار سے آراستہ ہوکر بلند مرتبہ انسان بنتا ہے اور دوسری طرف دُنیا پرست ہوس زدگی میں پڑکر حیوانیت و درندگی اختیار کرتا ہے۔

بعض لوگوں نے حقیقت کے متذکرہ دو تقابلی آیتوں پر اچھی طرح غور کیے بغیر یہ مفہوم اخذ کیا کہ جس کسی کی زندگی شاداب اور پُررونق نظر آئے، سمجھو کہ وہ ایماندار ہے اور "حیاتِ طیبہ" اسے بطور انعام قانونِ الٰہی کے تحت ملی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کی گذر حالات کی تنگی میں ہو رہی ہے تو وہ ذکرِ الٰہی سے یا ایمان سے یا دین سے اعراض کرنے والا ہے۔

یہ مفہوم اگر لیا جائے تو قرآن کی ساری تعلیم ہی اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ اصل مشکل "حیاتِ طیبہ" اور "معیشتِ ضنکا" کو سمجھنے کی ہے۔ حیاتِ طیبہ وہ ہے کہ جس میں ظاہری اسباب چاہے کم ہوں، مگر آدمی کا اخلاقی معیار بلند ہو، معاشرے میں اس کی نیکی کے مفید اثرات پڑتے ہوں، اسے اپنے دل میں اطمینان حاصل ہو کہ وہ خدا کے قریب ہے اور دولت اور خواہشات اور مروجات کی زنجیروں سے آزاد ہے۔ اسی طرح، "معیشۃً ضنکًا" کے معنی یہ ہیں کہ اسباب کی جامع فراوانی اور دولت کی کثرت ہو، مگر آدمی خود بھی ایسی بُرائیوں میں مبتلا ہو، اس کے گھر والے بھی ایسے بُرے بُرے خیالات و رسوم کا شکار ہوں۔ اس کا حلقۂ ربط بھی دُنیا پرستی اور جسم پرستی میں مبتلا ہو، اخلاقی قدروں کی

چمک سے ساری فضا خالی ہو، دل اندر سے کھوکھلا ہو تو ایسی زندگی میں بڑی تکلیف دہ گھٹن پائی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح بات کو افراد کی سطح سے اُٹھا کر جماعتوں یا قوموں اور حکومتوں کی سطح پر لے جائیے۔ اس پس منظر کے ساتھ سوچیے کہ بروئے قرآن و احادیثِ صحیحہ کتنے ہی نبی ایسے گذرے کہ جن کے ساتھ کبھی دس یا پانچ اور کبھی دو ایک دینی ساتھی راہِ حق میں چلے، درآنحالیکہ معاشی طور پر کھانے کے لحاظ سے فاقہ مستی اور پوشش کے لحاظ سے پھٹے پُرانے کپڑوں میں گذران کی۔ بعض انبیاء کو تو ایک بھی رفیق نہیں ملا۔ دوسری طرف نمرود اور فرعون اور شداد اور ان کے فوجی اور سول افسروں کے وہ ٹھاٹھ تھے کہ اگر دولت و خوشحالی ہی علامتِ فلاح ہے تو پھر فلاح ہی فلاح ہے۔ آخر کیا خلاصہ نکلا قانونِ عروج و زوال کا؟

میرا خیال ہے کہ ہمارے بزرگ بھائی ایک بار پھر سارے معاملے پر غور کریں۔

رسائل و مسائل

حضرت علیؓ کی خلافتِ بلافصل؟

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال :- آپ سے ایک دو مسائل دریافت طلب ہیں - اُمید ہے کہ کچھ وقت صرف کر کے ان پہ روشنی ڈالیں گے اور پریشانی سے نجات دلائیں گے - یہاں قریبی دیہات میں ایک شیعہ مجلس ہوئی - ایک شیعہ عالم نے اس میں تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مرحلے اور آغازِ دعوت ہی سے حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل مقرر کر دیا تھا - قریش کو بُلا کر اور دعوت میں کھانا کھلا کر فرمایا: "امداد کرو اسلام کی" کوئی بھی نہ اُٹھا - پھر حضرت علیؓ نے امداد کا وعدہ کیا تو حضورؐ نے فرمایا: "تو میرا بھائی ہے، ولی ہے، وصی ہے، وزیر ہے، خلیفہ ہے - اس کے لیے تفسیر ابن کثیر آیت: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء ۲۱۴) کے تحت بیان کردہ تفسیری روایات کا حوالہ دیا گیا - میرے پاس یہ تفسیر نہیں - آپ اسے دیکھ کر واضح کریں کہ حقیقتِ حال کیا ہے - علاوہ ازیں غدیرِ خم کے موقع پہ آنحضورؐ نے جو کچھ فرمایا، اُس کی تشریح بھی کر دیں -

جواب: آپ نے شیعہ عالم کی تقریر کا خلاصہ یہ نقل کیا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ دعوت اور روزِ اوّل ہی سے حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا تھا - قریش کو آنحضورؐ نے دعوت پر بُلا کر اور کھانا کھلا کر فرمایا کہ میری امداد کرو - صرف حضرت علیؓ نے امداد کا وعدہ کیا تو آنحضورؐ نے فرمایا: "تو میرا بھائی ہے، ولی ہے، وصی ہے، خلیفہ ہے"...... اس کے لیے ابن کثیر، سورۃ الشعراء، آیت

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء - ۲۱۴) کی تفسیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت قرآنیہ کو مسئلۂ خلافت سے متعلق سمجھنا اور اس آیت کی تشریح میں جو روایات ابن کثیر یا دوسرے مفسرین و مؤرخین نے درج کی ہیں۔ اُن سے حضرت علیؓ کی خلافتِ بلافصل کا استنباط و استخراج کرنا ایک عجیب و غریب نکتہ آفرینی ہے۔ اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، وہ صاف اور واضح طور پر یہ ہے کہ اپنے خاندان کے نزدیک ترین قرابت داروں کو ڈراؤ، دوسرے الفاظ میں منشائے ربانی یہ تھا کہ اپنے کنبے اور قریبی رشتہ داروں کو متنبہ کر دو کہ محض خاندانی اور نسبی قرابت دُنیا و عقبیٰ میں کسی امتیازی رو رعایت کا باعث نہیں بنے گی۔ مزید وضاحت اگلی آیات میں ہے کہ جو ایمان لائیں اور تیرا اتباع کریں۔ ان سے حسنِ سلوک اختیار کرو اور جو تمہاری نافرمانی کریں (خواہ وہ رشتہ دار ہوں) ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال سے بری الذمہ اور بیزار ہوں۔ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جدی خاندان بالخصوص بنو ہاشم، بنو المطلب کے افراد کو کھانے کی دعوت پر جمع کیا۔ اور فرمایا کہ میں تمہیں آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں، لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ (میں اللہ کے بالمقابل تمہارے کام نہیں آ سکتا۔) لیکن مخاطبین مشرکین پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور بدبخت ابولہب نے نہایت نازیبا جواب دیا۔ یہ مجمع تیس چالیس افراد پر مشتمل تھا، جن میں سے بعض اشخاص ممکن ہے دل میں آنحضورؐ سے خونی رشتے کی بنا پر نرم گوشہ رکھتے ہوں۔ لیکن علانیہ کسی نے بھی دعوتِ اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے وہ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ جس کا اعادہ و اعلان آپ نے یہاں بھی کر دیا۔

"تاہم اس منفی اور ناگوار ردِ عمل کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بجا طور پر یہ خیال اور خدشہ ہو سکتا تھا کہ اگر خاندان کے لوگوں کی اکثریت بھی میری دعوت پر لبیک کہنے سے باز رہی —— دیگر کفار و معاندین بھی میرے آزار کے درپے رہیں۔ اور معاذ اللہ ان حالات میں اگر میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دوں تو جو امانتیں، قرضے اور دیگر خاندانی ذمہ داریاں مجھ پر عاید ہوتی ہیں۔ اُن کو کون مسلمان ادا کرے گا؟ چنانچہ اسی سیاق و سباق اور پس منظر میں آپ نے فرمایا: مَنْ يَّضْمَنُ عَنِّيْ دَيْنِيْ وَمَوَاعِيْدِيْ وَيَكُوْنُ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ وَيَكُوْنُ خَلِيْفَتِيْ فِيْ اَهْلِيْ (میرے قرضوں اور معاہدات کی کون ضمانت دیتا ہے اور میرے اہل و عیال کی خبرگیری میں میری نیابت کون کرے گا کہ

وہ جنت میں میری معیت حاصل کرے؟ - اس سوال پر بھی خاندان کے دوسرے افراد خاموش رہے، مگر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اگر خلافت و نیابت زیر بحث تھی تو وہ وسیع ترین مفہوم کی حامل عمومی خلافت یا امامتِ کبریٰ نہیں تھی جو پوری اُمتِ مسلمہ اور اسلامی ریاست پر مجتمعاً حاوی و محیط ہو، نہ قریش کے ایک یا چند گھرانوں کے افراد اس کے مخاطب ہو سکتے تھے، جو اکثر و بیشتر مسلمان ہی نہ تھے۔

اس نیابت کے موقع پر اس ارشادِ نبویؐ کی جو تاویل و تشریح میں نے کی ہے بالکل یہی تاویل حافظ ابن کثیرؒ نے ساری روایات کو نقل کرنے کے بعد آخر میں فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

مَعْنَىٰ سُؤَالِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَعْمَامِهٖ وَاَوْلَادِهِمْ - اَنْ يَقْضُوْا عَنْهُ دَيْنَهٗ وَيَخْلُفُوْهُ فِيْ اَهْلِهٖ يَعْنِيْ اِنْ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچاؤں اور ان کے بیٹوں سے سوال کیا تو اس سے مدعا یہ تھا کہ اگر بالفرض آپؐ دشمنوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرما جائیں تو آپ کے واجب الادا قرضے کون ادا کرے گا)۔

اس سوال کے جواب میں حضرت علیؓ نے کہا: انا یا رسول اللہ (یا رسول اللہ میں یہ ذمہ داری ادا کروں گا)۔

ابن کثیرؒ نے جتنی روایات درج کی ہیں، ان میں کہیں بھی وصی کا لفظ وارد نہیں ہے۔ اگر ہوتا بھی تو اس سیاق کلام میں اس کا مفہوم بھی وہی ہوتا جو خلافت اور خلیفہ کا اوپر بیان ہو چکا۔ یہ بھی واضح رہے کہ صحیح تر اسناد سے جو الفاظ مسلم اور ترمذی میں ہیں۔ ان میں کسی میں خلافت کا ذکر نہیں۔ الفاظ فقط یہ ہیں: لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا (اے میرے رشتہ دارو، میں اللہ کے بالمقابل تمہارے کام نہیں آ سکتا)۔

جہاں تک غدیر خم والی روایات کا تعلق ہے، اس پر بحث مولانا مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ رسائل و مسائل حصہ دوم میں "اہل سنت اور اہلِ تشیع کا اختلاف" کے زیرِ عنوان کر چکے ہیں، براہ کرم اسے مطالعہ کر لیں۔

مطبوعات

سیرت خلیفۃ الرسول ؐ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

از جناب طالب الہاشمی ۔ ناشر: حسنات اکیڈمی لمیٹڈ ۔ ۱۹ سی منصورہ لاہور ۱۸ ۔ کاغذ سفید، کتابت وطباعت صاف، بڑے سائز کے ۶۱۶ صفحات ۔ مضبوط جلد مع سنہری ڈائی ۔ قیمت: ۷۵/- روپے

سیدنا ابوبکر صدیق عتیق کی سنہری شخصیت کے اتنے مختلف پہلو اور گوشے قابل توجہ ہیں (اور طالب ہاشمی صاحب نے کسی عنوان کو چھوڑا بھی نہیں) کہ ایک نظر میں موصوف کو دیکھنا اور دکھانا بہت مشکل ہے۔ سوانح نگار کا کام مشکل تھا، مگر تبصرہ کرنے والے کا مشکل تر، کیونکہ اسے تو صرف چند سطریں لکھنی ہیں ۔ پس میرا ذاتی تاثر تو اس مصرع میں آجاتا ہے کہ ؎

بعد از نبی ؐ بزرگ توئی، قصہ مختصر

بس اسی نکتۂ محبت کی تفسیر ہے جو طالب ہاشمی صاحب نے لکھی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضؓ میں بعثت سے قبل ۲۰ سالہ دَورِ دوستی گزرا تھا ۔ جس میں دونوں ایک دوسرے کو خوب جان سمجھ گئے تھے ۔ اس ابتدائی زمانے میں حضرت ابوبکر رضؓ کو جو مرتبہ مکہ میں حاصل تھا، اس کا بیان صفحہ ۴۰ سے ۴۴ میں دیکھیے ۔ پھر جناب صدیقِ عتیق کی ایک تصویر وہ ہے جو اوّلین "دَورِ محنت" کی تھی ۔ خود مصیبتیں اٹھائیں، ساتھیوں اور خصوصاً کنیزوں اور غلاموں پر ظلم ہوتے دیکھے اور ان کو خرید خرید کر آزاد کرایا ۔ یہ تصویر صفحہ ۴۶ سے ۵۲ تک کے بیان میں سامنے آتی ہے ۔ پھر ہجرتِ حبشہ کا ذکر ہے، دعوتی کام میں رفاقت اور حدیثِ معراج کی بلا جھجک تصدیق کا بیان ہے ۔ پھر ہجرتِ مدینہ میں حضورؐ کی رفاقت، غارِ ثور کے لمحات، سراقہ بن مالک بن جعشم سے مڈبھیڑ، ام معبد کے خیمہ تک قدوم کے حالات فلم کی طرح سامنے آتے ہیں ۔ پھر مدینہ کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۔ اور جلد ہی رمضان ۲ھ

سے غزوات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں جناب صدیقؓ حضورؐ کے نہایت قریبی رفیق کی حیثیت سے شامل رہے ہیں۔ بیعتِ رضوان کے موقع پر آپ کا کردار تصدیق و استقامت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ واقعات و فضائل تو بہت سے مذکور ہیں۔ مگر آپ کا ایک تو وہ عظیم الشان پارٹ تاریخ میں یادگار رہے گا جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حشر آفریں لمحۂ وصال میں آپ نے توازن برقرار رکھ کر امت کو تشتت وافتراق سے بچایا اور لوگوں کے حوصلے کو سنبھال لیا۔ اور حضرت عمرؓ کو جذباتی ہیجان سے نکالا۔ دوسرے آپؓ نے حضورؐ کی وراثت کا معاملہ نصِ حدیث کی بنیاد پر جرأت و صاف گوئی سے طے کر دیا۔ بعد ازاں اپنے دورِ خلافت میں دو اہم ترین زریں کارنامے ایسے ہیں جو عزیمت، توکل علی اللہ اور سیاست کاری کی مہارت کے لحاظ سے بہت قابلِ مطالعہ ہیں۔ اولین یہ کہ نہایت ایمرجنسی کے حالات میں فتنہ ارتداد کے اٹھنے اور نئی نئی نبوتوں کے جھنڈوں کے بلند ہونے پر ذرا بھی خوف زدہ ہوئے بغیر فتنے کی سرکوبی کے لیے پوری قوت جھونک دینا۔ دوسرے یہ کہ اسی فتنے کے ساتھ ساتھ ایک اور مفسدہ یہ پیدا ہوا کہ مختلف قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ایک وفد معاملہ طے کرنے آیا اور مشاورت منعقد ہوئی۔ جس کے طرزِ فکر میں کمزوری دیکھ کر جناب صدیقؓ نے ایسے فقرے کہے جن میں دلائل بھی تھے اور جذبۂ عزیمت کا زور بھی، لہٰذا ان فقروں کو سن کر ساری مجلسِ مشاورت خلیفہ رسولؐ کی ہم نوا ہو گئی۔ فرمایا:

> "خدا کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا۔ میں اس سے لڑوں گا، کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ خدا کی قسم! اگر وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بکری کا ایک بچہ دیتے تھے اور مجھے نہ دیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔" .... دوسرے قول میں فرمایا کہ" خدا کی قسم اگر ان لوگوں نے اونٹ کا گھٹنا باندھنے والی ایک رسی بھی مجھے دینے سے انکار کیا جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور زکوٰۃ دیتے تھے، تو میں ان سے اس کے نہ دینے پر جنگ کروں گا۔" (ص ۱۶۷ – ۱۶۸)

حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو اشکال پیش کیا اس کا جواب جناب صدیقؓ نے قرآن سے واضح کیا۔ اصل میں جو چیز یہاں مضمر تھی اور جسے مؤلف کو واضح تر کرنا چاہیے تھا وہ یہ تھی کہ اسلامی ریاست کا نظام کسی فرد کی ذاتی بادشاہت نہ تھی، اگرچہ اس کی محنتوں اور قربانیوں کا اس کی تشکیل میں عظیم

دخل تھا - یہ خدا کی زمین پر خدا پرستوں کی جماعت یعنی اُمتِ مُسلمہ کی ریاست تھی، جس کے اولین سربراہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے - اور اس دُنیا ئے موّقت میں حضورؐ کا وصال ہو جانے کے بعد سربراہی کی ڈیوٹی کی امانت اُمتِ مُسلمہ نے اپنے بہترین فرد کو سونپ دی - گویا ریاست اب بھی وہی تھی اور اس کا دستور اور اس کا پورا قانون اور اس کا ضابطۂ زکوٰۃ وہی پہلے والا تھا - اور اس دستوری و قانونی نظامِ حقوق و فرائض کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے تھے -

اسی خلیفۂ اوّل نے وہ مضبوط اسٹیج تیار کیا جس پر سے حضرت عمرؓ نے اس ریاست اور اس کی تہذیب کے استحکام و فروغ کے لیے علم، اخلاق، سیاست اور تلوار کی قوتوں کو اس شان سے استعمال کیا کہ مشرق و مغرب عقابِ انقلاب کے دونوں بازوؤں کے نیچے تھے -

اہم واقعات اور بھی ہیں - مثلاً حادثہ افک اور مالک بن نویرہ کا قتل، سلسلۂ فتوحات اور خدمتِ قرآن وغیرہ، مگر ہم اتنی دُور تک نہیں جا سکتے -

اس کتاب کے اندر حصہ دوم میں جناب کی شخصیت و کردار کی جھلکیاں دی گئی ہیں - اس حصے میں ذاتی حالات، محاسنِ اخلاق، فضل و کمال، بکھرے موتی، نظامِ خلافت، مالی نظام، عسکری نظام، اولاد، مواخاتی بھائیوں کا ذکر ہے، آخر میں کتابیات ہیں -

مؤلف کے مطالعہ کی وسعت اور عادلانہ نقطۂ نظر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور ان کے اندازِ تحریر کی موزنیت پر تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں -

---

عقل پرستی اور انکارِ معجزات | از مولینا عبدالرحمٰن صاحب کیلانی - ناشر: ناظم جامع محمدی اہلِ حدیث - گجرات - ملنے کا پتہ: مکتبۃ السلام، وسن پورہ، لاہور - صفحات: ۳۴۴
قیمت: ۲۵/ روپے

مغربی فلسفہ و فکر کا ہمارے ہاں ایک اثر یہ پڑا کہ نیچر یا قانونِ فطرت کے تحت تمام واقعات ہوتے ہیں - اُن کی زد سے پیغمبر، ولی، فرشتے اور معجزات کوئی بھی باہر نہیں - اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن میں بعض واقعات کا بیان ایسا ہے کہ یا تو آپ لفظوں سے نئے معانی پیدا کریں یا ہر بات کو استعارہ

بنا دیں۔ اس کے باوجود بھی کسی حد تک مضحکہ انگیزی باقی رہتی ہے۔ یہ دراصل سیکولر فلسفے کی جنگ تھی۔

پردۂ غائب میں رہ کر تمام کائنات کی کارپردازی کرنے والے خدا کے خلاف۔ تمام منکرینِ معجزات نے احادیث سے بھی جان چھڑانے کی کوشش کی۔ قرآن کے نصوص کے تازہ بہ تازہ معانی ایجاد کرنے کی فکر کی۔ شریعت کے قوانین و حدود کو ترک کر کے دوسرے قانونی نظاموں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اجتہاد کا ایک جدید الجدید تصور پیش کیا۔ بعض حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے کے لیے ہیر پھیر کیے۔

اس خاص فکری انداز کے حاملین ہر دور میں پہچانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب مولانا عنایت اللہ اثری صاحب (متعلق بہ اہل حدیث) ہیں۔ ان صاحب کی فکری اور بیانی جدتوں کا بڑا شاندار گلدستہ بنا کر مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیلانی نے پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے رنج و غم کے آنسوؤں کی شبنم بھی ان پر ٹپکائی ہے۔ اثری صاحب کی دو کتابیں "المقول المختار" اور "بیان المختار" کے مندرجات ان کے پیش نظر ہیں۔

اثری صاحب کی باتیں (خدا کے ہاں جو بھی درجہ پائیں)، افسانے کی طرح دلچسپ ہیں۔ مثلاً حضرت سیدہ مریم کے متعلق ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

حضرت مریم کا پہلے سے نکاح تھا، مگر کبیدہ خاطر ہو کر میکے چلی گئی تھیں (مَكَانًا شَرْقِيًّا) میاں بیوی میں اَن بَن ہو گئی، وہاں جا کر وہ رک گئیں (فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا) پھر اس کے سامنے فرشتہ بھیجا گیا۔ (یعنی شوہر انسانی قوتوں سے محرومی کی وجہ سے گویا فرشتے کی طرح تھا) وہ اس کے سامنے ٹھیک شکل میں گیا۔ (یعنی دوا و دعا سے اس کی تکالیف رفع ہو چکی تھیں)، یہ الہام حضرت زکریاؑ نے شوہر مذکور کے ہاتھ بھیجا تھا کہ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔ (یعنی اب عنائی نہیں رہی، اب میں تمہیں ٹھیک ٹھاک لڑکا دے سکتا ہوں۔ دیہ بھی فرمایا کہ یہ ساری باتیں خواب میں ہوئیں)۔ خیر شوہر صاحب اب بے رغبتی کی بیماری سے شفا پا کر سامنے چلے گئے، (فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا)، مگر مریم نے وہی شکایت کی جو واپسی سے مانع ہو گئی اور طلاق کا مطالبہ کیا۔ (اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ)، شوہر نے جواب میں اپنی صحت کا حال بھی سنایا اور اللہ پاک کا الہام

بھی۔ پھر مریم شوہر کے ہمراہ روانہ ہوگئیں اور گھر آباد ہوئیں۔ اب ان کا حمل ہوا اور شوہر سفر پر بھی چلا گیا۔ پھر وہ جِذْعِ النَّخْلَةِ تک پہنچیں اور شوہر بھی آگیا۔ کھجور کے مالک نے جو ذرا نیچے تھا اور کھجوریں بیچ رہا تھا۔ اُس نے ازراہِ ہمدردی حضرت مریم کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ کھجوریں درخت سے اُتار کے کھائے اور نیچے کی جانب یہاں چشمہ بہہ رہا ہے، اس سے پانی پیے۔ تکلّم فِی الْمَھْدِ کی اُلجھن یوں حل کرتے ہیں کہ مہد میں کہل اور کہل میں مہد ہو سکتا ہے۔ اشارت الیہ کا مشارٌ الیہ اثری صاحب کے نزدیک حضرت عیسیٰ نہیں ہیں، بلکہ زکریاؑ مراد ہیں، کیونکہ انہوں نے ہی نکاح پڑھایا تھا اور وہی جواب دے سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ کے ٹھنڈا ہو جانے کا معاملہ یوں سمجھاتے ہیں کہ "ہو سکتا ہے کہ وہ فتنہ و فساد کی آگ ہو، جسے اللہ پاک نے ٹھنڈا کر دیا ہو۔" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچ مچ انہوں نے آگ ہی جلانے کا ارادہ کر لیا ہو ـــــ کام بالکل تیار تھا، مگر اللہ پاک نے آپ کو بال بال بچا لیا۔

ذبحِ اسماعیل علیہ السلام کا قصہ یوں بیان کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب اُن سے خواب کا قصہ بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ آپ فی الحال ظاہری طور پر خواب پورا کر لیں، بعد میں حکم ہو تو میری جان حاضر ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو لِٹا کر خواب والی شکل پیدا کر لی۔ حکم آیا کہ بس ابراہیمؑ تو نے وہ نقشہ تو پورا کر دیا۔ اب بعد میں کوئی اچھی سی قربانی دے دینا۔

وادیٔ نمل کا قصہ یوں بیان ہوا کہ حضرت سلیمانؑ نے اس وادی کی طرف ڈیرہ ڈال دیا۔ وہاں کی رانی نے (ارکانِ حکومت سے) مشورہ کر کے سب کو خانہ بند ہونے کا حکم دیا تاکہ ظاہر ہو جائے کہ ہم جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر یہی مضمون قاصدوں کے ہاتھ لکھ کر تحائف کے ساتھ بھیجا، جسے دیکھ کر حضرت سلیمانؑ خوش ہوئے۔ حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں "عفریت من الجن" اور "الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ" کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔ انہیں اثری صاحب ٹھیکیدار قرار دیتے ہیں، جن سے حضرت سلیمانؑ نے ٹینڈر لیے کہ بلقیس کے تخت جیسا تخت کون مہیا کر سکتا ہے۔

اصحابِ کہف کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ باتیں عقل و فکر کے سراسر خلاف ہیں کہ وہ تین سو سال تک غار میں سوتے رہے۔ پھر اٹھ کر کچھ کھایا پیا۔ پھر جو سوئے تو آج تک نہیں جاگے۔

اب اس سلسلۂ مضحکات کو کہاں تک بیان کیا جائے۔ نہ کافی وقت ہے اور نہ فالتو صفحات۔ شائقین ہمارے اشاروں سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کیسا عالمانہ سیلابِ ہلاکت ہے۔

حدیث کا درایتی معیار | تالیف: مولینا محمد تقی امینی، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ناشر: قدیم قومی کتب خانہ مقابل آرام باغ۔ کراچی۔ قیمت مجلد ۳۲/- روپے

جہاں تک میں نے مولینائے محترم محمد تقی امینی کو بہت تھوڑا بہت جانا ہے۔ میں ان کو زمرۂ اہلِ حق میں سے سمجھتا ہوں اور ان کی اس کتاب کو جس کو لکھتے ہوئے ان کے سامنے دینی علوم کے ساتھ ساتھ آج کا فکری و تمدنی ماحول بھی ہے یہ بہت سی مفید بحثوں کا مجموعہ ہے۔ باتیں علمی زبان میں ہیں۔ عام مولویانہ یا مناظرانہ انداز نہیں ہے۔ مولینا کا انداز فکر بتاتا ہے کہ وہ حقائقِ دین سے پوری وابستگی رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید طبقوں کی الجھنوں کا مداوا بھی چاہتے ہیں، اس لیے دوسروں سے کچھ زیادہ آگے قدم بڑھاتے ہیں، بلکہ سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ۔ ان کے بیان میں اسلامی جدیدیوں اور اجتہادیوں کا کوئی اثر نہیں۔

ان کا اصل مبحث یہ ہے کہ صحیح حدیث کو کیسے جانا پہچانا جائے۔ اس کے لیے وہ پرکھ کے خارجی معیار بھی بتاتے ہیں اور داخلی بھی۔ یعنی روایت و سند کے قاعدے بھی اور درایت کے اصول بھی۔ درایت کے اصول جن کو کٹر روایت پسند گروہ بالکل تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کو مرتب بیان کر کے امینی صاحب نے بڑا علمی کام کیا ہے۔

میرے سامنے تقی امینی صاحب کا ایک اور مقالہ بھی اسی موضوع پر ہے۔ یہ شامل ہے "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" میں (ص ۱۰۷ تا ۱۱۶)۔ اس میں درایت یا داخلی جانچ کے ۲۴ اصول بیان کیے گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ باتیں اور بھی علماء نے پہلے بھی لکھی ہیں۔ مسئلہ صرف ان نازک فروق کا ہوتا ہے جو انسانی ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ نے لکھا کہ کوئی حدیث عام مشاہدہ اور عادت کے خلاف

نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا ایک غیر محتاط مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرے سے معجزات کا انکار کر دیا جائے۔ حالانکہ قرآن نے ان کا ریکارڈ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ بے شمار اقوام کے مشاہدات و تجربات میں داخل ہیں۔ آپ نے کہا کہ کوئی حدیث عقلِ عام کے خلاف نہ ہو۔ منکرینِ حق کا تو کہنا بھاری اکثریت کے لحاظ سے یہی تھا کہ گلی سڑی ہڈیوں کا دوبارہ زندہ کیا جانا ناقابلِ تصور ہے۔ وہ تو رسل کی دعوت تھی جو جہد اور استدلال اور تحملِ شدائد کے بعد حضورؐ اور مسلمانوں نے آہستہ آہستہ لوگوں کو قائل کیا۔ ورنہ بہ اوّلِ وہلہ توبات عقلِ عام کے خلاف تھی۔ آج بھی دین کی صدہا باتیں ایسی ہیں کہ ان کو دُنیا کی ___ یا کم سے کم مغرب کی ___ عقلِ عام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ مسلمان دُنیا کا قلیتی گروہ ہونے کی حیثیت سے اپنی جگہ کسی بھی چیز پر ایمان رکھ سکتے ہیں۔

بات متفقہ قواعدِ طب کے خلاف نہ ہو۔ ایک تو متفقہ قواعدِ طب کا پایا جانا ممکن نہیں۔ دوسرے قواعدِ مرض و علاج میں تو ارتقائے مسلسل ہو رہا ہے۔ اندریں صورت طب کو کیسے معیارِ فیصلہ بنایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح تاریخی حقائق کے بارے میں طے کرنا ہوگا کہ کیا چیز تاریخی حقیقت ہے اور کیا محض نظریہ یا قصہ کہانی، اور اس کا پُروثوق ثبوت کیا ہے۔

پھر آپ کہتے ہیں کہ چھوٹے کام پر بھاری ثواب کا ذکر جس حدیث میں ہو وہ درایت کے معیار سے ساقط ہوگی۔ محترم مولینا! تمام دین ہی میں چھوٹے چھوٹے کاموں کا بڑا بڑا ثواب مذکور ہے۔ جس فطرت اللہ کے قوانین کے تحت بیج سے درخت اور درخت پر پھل نمودار ہو سکتا ہے، جن قوانین کے تحت کھیتی لہلہاتی ہے اور کسانوں کو پھل لگتی ہے۔ جن قوانین کے تحت دوا کی رتی رتی بھر کی خوراک دو من جسم کو پچھاڑ بھی سکتی ہے اور ہلکا پھلکا شاداب بھی کر سکتی ہے، وہاں ادائے فرض کرنے اور حرام سے بچنے والے بندے کی عبادتیں اور صدقات، کمزوروں کی خدمات، یتیموں سے محبت، لوگوں سے مسکراتے چہرے کے ساتھ ملنا، راستے سے گندگی یا کوڑا ہٹا دینا۔ یا کبھی دلی جذبات میں ڈوب کر اللہ کی محبت یا خشیت یا اس کی طلب، عفو و رحمت کے ساتھ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دُعا کرنا، بڑے بڑے نتائج کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں کبھی ایک نگاہ، ایک لفظ، ایک پیسے کا لین دین، ایک مسکراہٹ، ایک "نہیں"، ایک چیں بر جبیں بڑے

بڑے معاملے اِدھر یا اُدھر طے کر دیتی ہے ۔ ہمارا ایک خیال و احساس ہمارے لیے ہدایت اور نیکی کے دروازے کھول سکتا ہے ۔ اور ہمارا ایک حیوانی جذبہ اور ہماری ایک بہیمانہ خواہش ہمیں جہنم کے راستے پر دھکیل سکتی ہے ۔

چھوٹے اجر اور بڑے اجر ، یا تھوڑی سزا یا بہت سزا کے معاملے اس دنیا میں بیٹھ کر طے کرنا ، جہاں ساری بڑی حقیقتیں پردۂ غیب کے پیچھے ہیں ، محال ہے ۔ یہ مسئلہ بڑی تفصیل چاہتا ہے ۔ مگر مجبوراً میں اشارات پر اکتفا کرتا ہوں ۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اجتہادیوں کو بچاتے بچاتے ہمارے اچھے لوگ کہیں خود بعض حقائقِ دینیہ سے دور نہ جا پڑیں ، یا خود بچ بھی جائیں تو اپنے قارئین کو غلط فکری میں مبتلا کر جائیں ۔

متاعِ آخرِ شب | مجموعہ کلام جناب حفیظ میرٹھی ۔ ناشر : الکتاب ، حیدر آباد ۔ ملنے کے کئی پتوں میں سے ایک : مرکزی مکتبہ اسلامی ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶ ۔ (بھارت) قیمت : ۴۰/ روپے

خدا پرستوں کے جس نئے قافلۂ ادب کے لیے آج سے تقریباً آدھی صدی پہلے کچھ لوگ راستہ بنا رہے تھے ، اس کا ایک جنوں کیش راہی حفیظ میرٹھی ، کڑی دھوپ اور گھور اندھیروں اور کڑکتی بجلیوں میں کانٹوں کو روندتا ہوا مسلسل بڑھ رہا ہے ۔۔۔۔ کیا معلوم وہ کہاں پہنچے گا ۔

اس کے پھوٹتے چھالوں سے جو پھول کھلتے رہے انہیں وہ شعر کے نظر افروز پیرائے میں ہمارے سامنے لایا ہے ۔ زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر رکھتے ہوئے ، شدید تہذیبی اور فکری تصادموں سے گزرتے ہوئے ، ذاتی احساسات اور تحریکی جذبات کو ہم آہنگ کرتے ہوئے اس نے جو علو آموز مجموعہ کلام ہمارے سامنے رکھا ہے وہ گراں بہا بھی ہے اور نادر بھی ۔۔۔۔ اور فنی سامراج کے جادو سے بچتے ہوئے تمام لوگ بڑے فخر سے اسے دوسروں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے ہی نالۂ ہائے کرب کی صدائے بازگشت ہے ۔۔۔۔ ہم جو صدیوں پہلے بھی یہی سفرِ کرب طے کر رہے تھے ، آج بھی اور صدیوں بعد بھی ہمارا راستہ یہی ہوگا لیکن

ان خارزاروں کی جگہ خیابان اور شبستاں نمودار ہو چکے ہوں گے۔

چند شعر:-

گھبرا کے مسلماں یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے ۔ کیا چھوٹ گیا ہاتھ سے دامانِ محمدؐ (نعت)

تُلے ہیں قتل پہ پھولوں میں تولنے والے ۔ اک ایسا بول ہیں جھوٹوں کے درمیاں لوگو

موجِ ہوا سے تراشا ہوا اندازِ خرام ۔ آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پہ

میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا ۔ جس کا جوان آئینہ خانے میں رہ گیا

بازارِ زندگی سے قضا لے گئی مجھے ۔ یہ دور میرے دام لگانے میں رہ گیا

دردِ دل پہ تبصرہ تو بہت ہو چکا ۔ درد کو آپ محسوس بھی کیجئے

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے ۔ فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

سنائی پھر نہیں دیتی ضمیر کی آواز ۔ دلوں پہ جب سروساماں سوار ہوتے ہیں

سمجھ رہا تھا کہ محفوظ اپنے گھر میں ہوں ۔ مگر یہ گھر نے بتایا کہ میں بھنور میں ہوں

ہو گئے لوگ اپاہج یہی کہتے کہتے ۔ ابھی چلتے ہیں، ذرا راہ تو ہموار بنے

جُدا ہے سارے زمانے سے اپنے فن کا مزاج ۔ نہ کوہ کن سے ملا اور نہ تیشہ گر سے ملا

بغیر کسی انتخاب کے جو شعر سامنے آیا، میں لکھتا گیا۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ "متاعِ آخرِ شب" ساری کی ساری دکانِ لعل و گہر ہے۔

اِن صفحات میں زیادہ لکھنا ممکن نہ تھا۔ سیارہ میں تفصیلی تبصرہ آسکے گا۔

بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان مؤلف: راشد شاذ۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف مسلم اُمّہ افیئرز۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱۔ انڈیا۔ پوسٹ بکس ۷۷۔ قیمت: ۳/- روپے

اچھے کاغذ اور خوبصورت طباعت کے ساتھ بڑا فکر طلب اور تشویش انگیز مقالہ ہمارے سامنے ہے۔ جب کسی ملک میں بگاڑ اور کسی قوم کے لیے مصیبت کا لمحہ آتا ہے تو صحیح توازن کے ساتھ تاریخی ڈرامے کی شریک قوموں کو سمجھنا اور اُن کی ذمہ داریاں متعین کرنا، اور ان میں سے کسی کو تباہی سے بچ نکلنے کی نازک پل صراط دکھانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جسے خوبصورت ادبی انداز اور درمندانہ طرزِ فکر کے ساتھ مؤثر انداز میں پیش کر دیا جائے۔

پھر فتنہ کی آگ کو بھڑکانے اور اس سے جھلسنے والوں کو علامت کے انداز سے کوئی ہدایت کرنا یا کوئی اقتناعی حکم سنانا نہایت غیر عملی مشغلہ ہے۔ طوفان کے اُترنے کے بعد اس کا تجزیہ کیجیے اور آرام سے لوگوں کو سمجھائیے۔

پھر میدانِ تاریخ میں ٹکراتی ہوئی قوتوں کی روش پر محاکمہ کرنا ادنیٰ درجے میں صحافی کا اور اونچی سطح پر مؤرخ کا کام ہوتا ہے۔ مگر یہ دونوں حالات کی رَو کو اچھے رُخ کی طرف موڑنے کے لیے کام ہی نہیں کر رہے ہوتے۔ مؤثر قوت وہ لیڈر ہوتا ہے، جس کے استدلال کا گہرا اثر تو دونوں جانب پڑے، مگر کم سے کم وہ کسی ایک قوت کو اپنے ساتھ لے کر کسی پسندیدہ راستے پر چلا سکے۔ اس پمفلٹ کا مقالہ نگار کم سے کم آخری نوعیت کا کردار نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس قسم کی تحریروں میں بیان شدہ ادھوری حقیقتوں کے اثراتِ بد اس کشمکش میں کمزور قوت کو اور بھی خراب کریں گے جو اٹل طریق سے درپیش ہے۔

معاملے کی بنیادی ریڈنگ ہی درست نہیں۔ یعنی یہ بات کہ پاگل اکثریت اگر تمہارے گال پر

تھپڑ مارے تو اگر تم خوشی سے دوسرا گال آگے نہیں کرو گے تو اس کے تعصب کی آگ اور بھڑک جائے گی۔ حالانکہ یہاں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کی ایک لمبی تاریخ ہے اور اس کا ریکارڈ موجود ہے۔ ہندو نے ہمیشہ مسلمان کو کچلنے اور ذلیل کرنے کی کوشش کی اور مسلمان قربانیاں دے کر اپنی سخت جانی کی وجہ سے ہزار خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود بھی زندہ رہا۔ "مسلم امہ انسٹی ٹیوٹ" کے نقطۂ نظر کے مطابق بابری مسجد پر جونہی ہندوؤں میں شوق قبضہ نمودار ہوا تھا، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ ریزولیشن پاس کرکے اور وفد بھیج کر درخواست کرتے کہ ہمیں بڑی مسرت ہوگی اگر آپ اس مسجد پر قبضہ فرمالیں، بلکہ اور بھی جہاں جہاں ہماری مسجدوں کو آپ مندر بنانا چاہیں، بصد شوق بنالیں۔ ہم مسلمان لوگ تو صرف تبلیغ کا کام کرتے ہیں، سو وہ کرتے رہیں گے۔ تا آنکہ ایک دن خود ہی تم ہماری مسجدیں ہمیں واپس دے دو گے۔

سوال یہ ہے کہ وہ جہاں کہیں جانوں پر حملہ کرتے ہیں اور جہاں کہیں عصمتوں کو تاراج کرتے ہیں، وہاں یہ بھکشوؤں والی پالیسی کیا تقاضا کرے گی؟

اور ہندوستان ہی کا معاملہ نہیں۔ اگر آسام میں، برما میں، اسرائیل میں، افغانستان میں، فلپائن میں، یوگوسلافیہ میں، یونان میں کہیں بھی مقاومت دکھا رہے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ "سچا اسلام" تو اُن کو یہ راہ دکھاتا ہے کہ سب کچھ چپ چاپ مخالفوں کے حوالے کر دو اور پھر تبلیغ کرو۔ بلکہ بلکہ جن مسلمانوں نے تاتاریوں کا عین موسلی پر مقابلہ کرکے اُن کو شکست دی تھی اور صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا جو پارٹ رہا۔ اور عربی اور افریقی اسلامی ممالک میں اور خود برصغیر میں مغربی استعمار کی مزاحمت میں مسلمانوں نے جو قربانیاں دیں وہ سب انسٹی ٹیوٹ آف امت مسلمہ افیرز کے نقطۂ نظر سے اسلامی ذمہ داریوں سے انحراف کا سبب تھیں۔

آج اگر ترکیہ کی ایماندار لڑکیوں نے سر ننگا رکھنے کے حکم کو چپ چاپ مان لیا ہوتا تو کیا ان پر فرشتے مبارک باد کے گلدستے پھینکتے، یا مسلمانانِ عالم تحسین کے لالہ و گل نچھاور کرتے۔ ان مجاہدات نے پردے کے ایک حکم کے تحفظ کے لیے جنگ لڑی اور کامیاب رہیں۔

بھارت کی ہندو اکثریت ایسے اسلام کی جڑیں کھود دینا چاہتی ہے، جو انفرادی عقیدوں اور خانقاہی اخلاقیات اور ٹھنڈے ٹھنڈے بلکہ فدویانہ لفظوں سے ذرا بھی آگے بڑھنا چاہے۔

اسلام کی بنیاد پر کوئی مضبوط اجتماعیت بنے، یا اسلامی نظام کا کوئی تصور راسخ ہو یا اسلامی تہذیب کا کوئی نقشہ پیش نظر رکھا جائے۔ یا دستور، سیاست، معیشت اور معاشرت کے قانونی معاملوں میں مسلمان کسی خاص رجحان کو پسند کریں بلکہ پسند کرنے کی جرأت کریں تو ایسے اسلام کے لیے بھارت تو کیا مسلمان ریاستوں میں بھی کھلی جگہ نہیں۔

یہ سارا فلسفہ کھڑا کیا گیا ہے، مسلمانوں پر قوم پرستانہ رجحانات کا الزام رکھتے ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی دور میں صحیح اسلامی تنظیمیں موجود نہ رہیں اور اگر موجود ہوں تو انہیں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے لئے فرصت نہ ہو بلکہ وہ ایسی دلچسپیوں کو تباہ کن سمجھیں تو آخر اور کسی نہ کسی نوع کی اجتماعیتیں تو ابھریں گی اور وہ کام کریں گی۔ آپ کا کام ان سے الجھنا نہیں (جیسا کہ آپ ہندو اکثریت سے الجھنے سے اتقا کرتے ہیں) آپ اپنی تبلیغ میں محو رہیئے۔ لوگ اپنے مسائل کو خود حل کرتے رہیں گے۔

آج بولنا اسے چاہیئے جو اس وقت کی صورت حالات میں بھی مسلمانوں کے لئے امید و تقویت کا ذریعہ بنے اور مستقبل کے لئے بھی ان کی اجتماعیت کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر مضبوطی سے کرے۔ وہ کام مثلاً سو سال بعد نتیجہ دے گا۔ لیکن اس سے پہلے موجودہ مسلمانوں کو مظلومیت اور ناامیدی اور پریشان نظری کی قوتوں کے ہاتھوں تباہ و برباد تو نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ وہ قومیت کے سہارے پر بھی زندہ رہیں تو اس کا امکان ہے کہ ان میں سے ایک ایک فرد کو آہستہ آہستہ اسلامیت کی بنیادوں پر لایا جا سکے۔

مختصر یہ کہ تبصرہ نگار متذکرہ پمفلٹ میں پیش کردہ فلسفہ طرازی کو نہ مسلمانوں کے موجودہ حالات میں مدد دینے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور نہ مستقبل میں ان کو کوئی غیرت مند تہذیبی قوت بنا سکتا ہے۔

"امتِ افروز" سے وابستہ برادران کو چاہیئے کہ وہ بابری مسجد اور دوسرے موضوعات و مسائل کو خارج از بحث رکھیں کیونکہ ان کا نقطۂ نظر اسی کا متقاضی ہے۔ ان میں سے ہر فرد پمفلٹ کی سرِ عنوان آیت کے مطابق "اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں"۔ باقی کام خدا کے دوسرے عزیمت دار مسلمانوں پر چھوڑ دیں۔

خونِ حرمین | از مولانا سید غفور شاہ صاحب الحسامی - ناشر: عامر اکیڈمی، ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور ۱۶ - صفحات: ۸۸ قیمت: ۶/- روپے

ہم مسلمانوں کی کتابِ تاریخ ایسے بہت سے ابواب رکھتی ہے جو ہمارے خون سے لکھے گئے۔ انہی میں سے ایک دورِ شریفِ مکہ کا دور ہے۔ جبکہ انگریزوں نے ہمارے مقاماتِ مقدسہ، شعائرِ دینی اور عام حقوقِ انسانی کی حد درجہ بے احترامی کی۔ انگریزوں کی ترک دشمنی نے دنیائے عرب میں یہ شورش اٹھائی کہ ادارۂ خلافت کے "نام" سے جو وحدت دولِ اسلامیہ میں قائم تھی اور خصوصاً ترکوں کو جو فعالانہ دخل عرب ممالک اور فلسطین و مصر وغیرہ میں حاصل تھا وہ ختم ہو تاکہ ترکوں کے خلاف انگریزوں کا جنگی انتقام بھی ہو جائے اور مسلمان ممالک و اقوام کو پارہ پارہ کر کے استعمار کی تیز رفتار پیش قدمی کے لیے راستے بھی بنائے جائیں۔ تقریظی سطور مولانا محمد سعید الرحمن علوی صاحب نے لکھی ہیں —

داستانِ درد کا آغاز مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تحریر کردہ ایک رسالے کے اقتباسات سے ہوتا ہے۔

حجاز کے سواحل میں عربوں کو مخاطب کر کے بہ اشتہار ہوائی جہازوں سے گرائے گئے کہ تم ترکوں کو نکال دو، برطانیہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ چنانچہ آج تک مسلمانانِ عالم سے خیر خواہی ہوتی چلی آ رہی ہے۔

عرب کے لیے غلہ کی رسد بند کر دی گئی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ جبل بوقبیس اور مکہ کے مقبرۂ شہداء پہ توپیں نصب کی گئیں۔ ترکی افسروں، خواتین اور بچوں پر گولہ باری کی گئی۔ طائف پہ گولہ باری کی گئی۔ مدینہ دو برس کے لیے محصور رہا۔ فاقہ کشی ایسی کہ قبروں سے مردے نکال کر بھوک مٹانے کے واقعات ہوئے، حاجیوں کو سخت اذیتیں دیں، ان کا مال لوٹنا، بے محابا اُن کے خون سے ہاتھ رنگنا۔ خاص منصوبے سے ان پر بدوؤں کے حملے جن سے نجات کے لیے فی اونٹ ایک خاص غنڈہ ٹیکس کی ادائی۔ مسجد نبویؐ کی روشنی کا انتظام ختم۔ مسجد کے قالین چوری ہو گئے۔ مکہ کی گلیوں میں مسلمانوں کو رسیوں سے باندھ کر گھسیٹا گیا۔ پردہ نشین عورتیں انگریزوں کی قید میں چلی گئیں۔ کعبہ کے سامنے مسلمانوں کو تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ غلافِ کعبہ کو آگ لگا دی گئی۔

اب ساری کتاب تو لکھی نہیں جا سکتی۔ عبرت اندوزی کے لیے خود پڑھیے۔ انگریزوں نے ترکوں اور عربوں

کو ہمیشہ کے لیے کاٹ کر ایسے مفاد حاصل کیے۔ اور مسلمانوں پر جابجا وہ قہر ڈھائے کہ ان کی کوئی تلافی نہیں۔ ایک مسئلہ فلسطین ہی کتنا خوفناک ہے جو مسلمانوں کے افتراق کی بنا پر پیدا ہوا۔
کیا سپرپاورز اور مغرب کی پیش رو حکومتیں اسی طرح ہمیں بے وقوف بنا کر استعمال کرتی رہیں گی۔

چادر اور چار دیواری	سید مظہر علی ادیب۔ ناشر: مکتبہ السفیر، اردو بازار لاہور ۲۔

قیمت: ۹ روپیہ۔

سید مظہر علی ادیب بہت صاف ستھرے ذہن کے ساتھ دولتِ ایمان اور سعادت مطالعہ سے بہرہ مند ہیں۔ مغرب کی الحادی اور مادہ پرستانہ تہذیب نے انسانوں کو حیوانی سطح پر لا کر عورت کو آزادی اور مساوات کے نام پر جس طرح گھروں سے نکال کر گھروں کو اجاڑا ہے اور باہر عورت کو جن دردناک صورتوں میں نشانۂ استحصال بنایا ہے۔ مظہر ادیب اس کا خاص مطالعہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث کی تعلیم کو بھی جانتے ہیں۔ پس اس موضوع پر ایک ماہر کی حیثیت سے لکھتے ہیں۔

چادر اور چار دیواری میں موجودہ غیر اسلامی معاشرت کے بگاڑ کی عبرتناک تصویر بھی دکھائی دیتی ہے اور اسلامی تہذیب کی پاکیزہ فضائیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اس تقابلی مطالعہ سے ہر معقول آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ راہِ حق اور راہِ امن و نجات کدھر ہے؟

چنار	میگزین گورنمنٹ کالج، گڑھی دوپٹہ، مظفر آباد۔

ایک کالج کے طلبہ نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں اتنا ضخیم اور شاندار رسالہ مرتب کر کے بڑی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ مضامین میں عنوانات اور اسالیب اور لکھنے والوں کے لحاظ سے بڑا تنوع ہے۔ ۲۸۴ صفحے بھرتی کی تحریروں کے بغیر تیار کر لینا قابلِ تحسین ہے

العلم	سہ ماہی مجلہ۔ الطاف علی بریلوی - مدیر: سید مصطفیٰ علی بریلوی (علیگ)

بہ اہتمام: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ - آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ پتہ: 1- جے ۱۰/۴۵ ناظم آباد کراچی۔ قیمت خاص نمبر/ ۱۵ روپے۔ عام شمارہ ۵ روپے۔ چندہ سالانہ/ ۲۰ روپے

اکرام الحق اورنگ ۔ افسانے ؛ دیوار ۔ ایک چہرہ کئی روپ، نئی منزل کے مسافر، جاگتی آنکھوں کا خواب، ننھا نے خودکشی کر لی (سچی کہانی) ۔ دینی پہلو سے ۔ "حج کی فضیلت" "علمائے امت کا کردار"

الاخبار مواد کے اعتبار سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی بہت اچھا معیار رکھتا ہے ۔ امید ہے کہ فروغ حاصل کرے گا ۔

مقتدرہ قومی زبان کے رسائل | ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی ۔ مقتدرہ قومی زبان ۰ مکان ۱۰ گلی نمبر ۳۲، سیکٹر ۸/ا ، اسلام آباد ۔

اس سے قبل بھی رسائل کا ایک سیٹ مقتدرہ کی طرف سے شائع ہوا تھا اور ہم نے ان صفحات میں تعارف کرایا تھا ۔ اب پھر ایک سیٹ موصول ہوا ہے ۔ نہایت اچھی طباعت اور رنگین سرورقوں کے ساتھ حسبِ ذیل مقالات مل سکتے ہیں ۔

۱۔ سیکرٹری ایٹ انسٹی ٹیوٹ (اردو ونگ) از معین احمد صدیقی
۲۔ براہوئی سے اردو ترجمہ ۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر ۔
۳۔ سید مسعود حسن رضوی، ادیب ۔ (کتابیات) از ڈاکٹر طاہر تونسوی ۔
۴۔ آغا حشر کاشمیری (کتابیات) از ڈاکٹر اے بی اشرف ۔
۵۔ سعادت حسن منٹو (کتابیات) از ڈاکٹر علی شاہ بخاری ۔
۶۔ شرعی عدالت میں ترویج اردو ۔ از ساجد الرحمٰن صدیقی ۔
۷۔ اردو نامہ ۔ لاہور کے منتخب اداریے ۔ از میاں محمد اسلم ۔
۸۔ سعودی عرب میں اردو ۔ از محمد حنیف شاہد ۔

ان کا مطالعہ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت مفید رہے گا قیمت کسی پر درج نہیں ۔

اشاعتِ خاص

ترجمان القرآن جولائی ۱۹۸۷ء

شریعت بل نمبر

واحد مقالہ

شریعت بل کا علمی جائزہ

از

مولینا گوہر رحمٰن صاحب رکن قومی اسمبلی

مہتمم دار العلوم تفہیم القرآن ۔ مردان

(ادارہ)

پھر آگیا مقامِ غم

ایک صحت مند، گورا چٹا، ہنستا ہنستا دانشور یکایک بلڈ کینسر کا درد و کرب بھگتنے کے لیے سروسز ہسپتال میں داخل ہوا۔ اور بس چند ہی ہفتوں میں صبر کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کر کے آخرت کے بلند تر مقامات کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یہ تھے پروفیسر عبدالرشید ارشد جو محکمۂ تعلیم پنجاب میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہے، جنھوں نے میٹرک سے ایم اے تک کی تعلیم ہمیشہ فسٹ کلاس میں حاصل کی اور عربی ایم اے میں فسٹ کلاس فسٹ رہے۔ قاری بھی تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند، رفیقوں دوستوں سے تعاون، اخوت کی اچھی مثال، ہسپتال میں آخر وقت تک ادائے نماز اور اپنی بیماری اور اس کے انجام کو اچھی طرح جاننے کے باوجود عالی ہمتی کا بہترین معیار پیش کیا۔

اُن کا ایک اعزاز یہ تھا کہ وہ تنظیم اساتذہ پاکستان کے ناظم شعبۂ امورِ اساتذہ پنجاب تھے۔ تنظیم نے ایک برادری کی طرح ان کے گرد حلقہ بنائے رکھا۔ اور ان کے اکابر یہ سوچ رہے تھے کہ اُن کو علاج کے لیے باہر بھجوانے کا انتظام کیا جائے۔ اسلامی جمعیت طلبہ، طلبہ عربیہ منصورہ ہسپتال اور جماعتِ اسلامی کی طرف سے مختلف صورتوں میں ارشد صاحب کی جان بچانے کی کوششیں کی گئیں۔ ۲۸ بوتل خون رضاکارانہ طور سے ان کے جسم کو توانا رکھنے کے لیے نوجوانوں نے دیا۔ منصورہ میں جنازہ پڑھایا گیا اور رات کو ایمبولینس گاڑی میت لے کر شکرگڑھ روانہ ہو گئی۔

بڑی صاحبزادی نے مرحوم کی زندگی میں حفظ قرآن مکمل کر لیا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوٹے ہیں اور تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ شکرگڑھ میں دوسرا جنازہ ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت اور ان کے بیوی بچوں اور تمام اہلِ خاندان پر خاص رحم وکرم کرے۔ آمین۔